راز قدرت

راز قدرت

از تصنیف

عمدۃ المحققین زبدۃ المدققین حضرت

سرکار سید الحکما علامہ حکیم مولوی

سید قمر الزماں صاحب قبلہ

پروفیسر فلسفہ میرٹھ

زر ہدیہ [illegible]

سرکار علامہ سید قمر الزمان صاحب مدظلہ

رازِ قدرت

از تصنیف

عمدۃ المحققین زبدۃ المدققین حضرت

سرکار سیّد الحکماء علّامہ حکیم مولوی

سیّد قمر الزماںؔ صاحب قبلہ

پروفیسر فلسفہ

دیباچہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین المعصومین۔

آج میری انتہائی مسرت اور خوش قسمتی کا دن ہے کہ آپ حضرات کی خدمت میں ان شکستہ خیالات کو لیکر جو "رازِ قدرت" کی صورت میں ہیں حضوری کا شرف حاصل کرتا ہوں۔ مصنفین کا قاعدہ ہے کہ دیباچہ میں اپنے اور اپنے آبار کرام کے زریں کارنامے اور نسب نامہ پیش کرتے ہیں۔ میں ننگ سادات عظام ہونے کی حیثیت سے اپنی اور اپنے آبار کرام کی خدمات کے اظہار سے شرماتا ہوں، اس کے علاوہ اپنی عمر میں کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں پاتا جس کو فخر کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کروں۔ اگر یہ کہوں کہ میں شریف باپ کا بیٹا ہوں، شریف ماں کا دودھ پیا ہے تو مجھ سے ہزاروں شریف خاندان سطح زمین پر آباد ہیں۔ اگر یہ عرض کروں کہ میں خادم علوم مشرقیات ہوں تو سینکڑوں صاحبان علم مادر گیتی کی گود میں پرورش پا رہے ہیں۔ اس لئے فخر ومباہات کے کوچہ سے بچکر اُس خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے مذاق سلیم عطا کیا۔ میں اس خدا کا ممنون کرم ہوں جس نے مجھے فطرت انسانی کا صحیح علم عنایت فرمایا۔ اگر وہ مجھے یہ دونوں نعمتیں عطا نہ فرماتا، تو میں

ان مصائب کے ہجوم میں، اُن آفتوں کے اژدہام میں، اُن کاوشوں کے دفور
میں جب کہ یہ سمجھ چکا تھا کہ زمانہ کے ترکش میں جتنے زہر آلود تیر ہیں اُن کا رُخ میری
طرف ہے ثابت قدم نہ رہتا، میں نے ہمیشہ آنے والے غموں کا خوش پیشانی
سے استقبال کیا۔ زمانہ کے بحرِ ذخار میں جب طوفان آیا اور میرے اقبال کی
کشتی ڈگمگائی تو ناخدائے نصیب نے خود مجھے غرق کرنے کی کوشش کی۔ میں
ڈوب ہی چکا تھا کہ خدا کی تائید نے سنبھال لیا۔ آفت کا جو تیر میری طرف آتا تھا
بدقسمتی اپنے ہاتھ سے اس کو ٹھیک نشانہ پر رکھدیتی تھی لیکن غیبی امداد زخموں کو
مندمل کرتی رہی۔ کہاں یہ کشمکشِ عالم اور کہاں فراغت تصنیف۔ اس کا خیال
بھی نہ تھا کہ میں اپنے دماغ کے ذخیرہ کا نمونہ کسی وقت پبلک کے سامنے پیش
کرسکوں گا۔ اسی اثنار میں ایک فاضل وکیل دہریہ نے اسلام پر خصوصاً اور دیگر
مذاہب پر عموماً کچھ اعتراض کئے، اور میرے ایک دوست سے کہا کہ میرے
اعتراضوں کے جواب ابتک جو بعض علمار نے دئے وہ منقولی تھے۔ میں چاہتا ہوں
کہ فلسفی دلائل سے جواب دئے جائیں، اس لئے میرے لایق دوست نے مجھ
سے جوابوں کی فرمایش کی۔ میں اس تردد میں تھا کہ کیا کروں، دل و دماغ حوادث
کا نشانہ بن چکے۔ ذہانت و ذکاوت جواب دے گئی لیکن غیبی امداد نے اپنا تسکین
دینے والا ہاتھ میرے دھڑکتے ہوئے دل پر رکھا۔ اس لئے مجھے اپنے پریشان
خیالات کے اظہار کرنے کی جرأت ہوئی۔ اس کتاب میں ابتدائی اٹھارہ سوال

فاضل دہریہ وکیل کے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ مختصر جواب لکھوں۔ جب قصد کیا تو بات بڑھ گئی اور کتاب کی صورت بن گئی۔ خیال ہوا کہ دیگر حضرات جو شبہ اسلام کے متعلق کرتے ہیں اُن کو بھی رفع کروں، اس لئے کتاب میں دوسرے بابوں کا اضافہ کیا۔ آخر میں باب استفسار قرار دیا جس میں اُن حضرات کے اعتراضوں کا جواب دیا جو بذریعہ خطوط مجھ سے جواب طلب کر کے عزت افزائی فرماتے ہیں میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اُٹھا کر لرزتی ہوئی زبان اور ٹوٹے ہوئے دل سے اُس بے نیاز کی درگاہ میں دُعا کرتا ہوں جس نے مجھے بنی نوع انسان کی اصلاح کا درد دیا کہ وہ بلا تخصیص مذاہب تمام انسانی برادری کو میرے ان پریشاں خیالات سے فائدہ حاصل کرنے کی توفیق عنایت فرمائے ورنہ میری کتاب کو ......ابوں سے محفوظ رکھے۔

معذرت

ہر مصنّف تصنیف سے قبل اسی فن کی کتابوں سے اپنے دماغ میں مواد جمع کرتا ہے، لیکن میں نے جس میدان میں قدم رکھا اُس فن کی کوئی کتاب اس سے قبل نہیں لکھی گئی تھی، اور اگر کوئی کتاب ہو تو میرے پاس موجود نہ تھی، اس لئے میں نے جو کچھ لکھا وہ میرے ہی کمزور دماغ کا نتیجہ ہے۔

ننگ بنی آدم

قمر الزّماں سبزواری

۱۴ ر ستمبر ۱۹۳۷ء

باب ۱

کیا چاند، سورج، ستارے، وغیرہ کو خدا نے بنایا ہے اور ان کا بنانیوالا واحد ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ چند فاعلوں نے مل کر انہیں بنایا ہو، خدا کے وجود اور اُس کی توحید پر کیا دلیل ہے۔ ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ مادّہ نے خود ترقی کر کے موجودہ عالم کی صورت اختیار کی ہو۔ اس لئے وہی خالق مخلوقات ہونیکا مستحق ہے۔

باب ۲

اگر خدا ایذا رسانی کو روا نہیں رکھتا تو دُنیا میں انسان کو طرح طرح کی تکلیفیں کیوں پہنچتی ہیں۔ کیا انسان کی تکلیف ہی پر نظامِ تمدّن موقوف ہے

باب ۳

شیطان کب اور کس نے اور کیوں پیدا کیا۔ اس کو بجز چند اہل مذہب دُنیا کی تمام قومیں کیوں تسلیم نہیں کرتیں۔

باب ۴

کیا شیطان خدا کی بہ نسبت زیادہ قوی ہے یا وہ بھی حکم خدا کا مطیع و فرمانبردار ہے، اگر شیطان خدا کی بہ نسبت قوی نہیں تو وہ سرکشی کیونکر کرتا ہے۔

باب ۵

جب خدا گزشتہ اور آئندہ حالات سے واقف تھا تو اس نے شیطان کو کیوں پیدا کیا۔

باب ۶

اہل ہنود ویدوں، عیسائی انجیل، یہودی توریت، مسلمان قرآن، کو خدا کی کتاب مانتے ہیں۔ اس لئے اِن میں غلطی نہ ہونی چاہیئے۔ حالانکہ ہر ایک مذہب دوسرے کی کتاب کی غلطیاں نکالتا ہے۔ اِن میں غلطی کس بِنا پر ہوتی ہے۔ اور کون مذہب غلطی کرتا ہے

باب ۷

کیا خدا کو یہ علم نہ تھا کہ اِنسانی دماغ اِس قابل نہیں کہ وہ شیطان کا مقابلہ

کر سکے۔ اگر نہ تھا تو اس کا علم محدود ہُوا۔ اور اگر تھا تو اس نے اتنی عقل انسان کو کیوں نہیں دی کہ وہ شیطان کا مقابلہ کرتا۔

باب ۸

ہر انسان بھوک پیاس وغیرہ کو فطرتاً محسوس کرتا ہے، اسی طرح اگر کوئی مذہب فطری اور دین الٰہی ہے تو اس کو انسان فطرتاً محسوس کیوں نہیں کرتا۔

باب ۹

امتحان صرف اُس کا لیا جاتا ہے جس کے حال سے امتحان لینے والا ناواقف ہو۔ کیا شیطان اور انسان کے افعال سے خدا واقف نہیں۔ اگر واقف ہے تو انسان کا امتحان شیطان کے ذریعہ سے کیوں لیا جارہا ہے۔ انسان اور شیطان کا تصادم شیر اور بکری کا مقابلہ ہے۔ اگر بکری شیر کا مقابلہ نہ کر سکے تو اس کمزور کو کس بنا پر سزا دی جائے گی۔

باب ۱۰

خدا نے اب تک شیطان کو کیوں فنا نہیں کیا۔ کیا کوئی چرواہا اس کو پسند کرے گا کہ اس کے گلّہ کو بھیڑیا ستائے۔ کیا وہ بھیڑیے کے نیست و

نابود ہونے کی کوشش نہ کرے گا۔

باب ۱۱

سب سے پرانا مذہب کون ہے۔ اور کس بنا پر اس کو پُرانا کہا جاتا ہے کیا یہ مذہب دُنیا کے ہر خطہ پر رائج تھا۔ اور جب خدا نے سب انسانوں کے لئے ایک سچا مذہب بنایا ہے تو اتنے مذہب کیونکر ہو گئے۔ کیا خُدا کے مقابل میں کوئی دوسری طاقت ہے جس نے اس کی مرضی کے خلاف اتنے مذہب رائج کر دئے۔

باب ۱۲

جب ہر مذہب میں چوری، ڈکیتی، زنا، جھوٹ وغیرہ ناجائز ہیں تو یہ کیونکر کہا جاتا ہے کہ فلاں مذہب ہی نجات دیگا اور بہشت تک پُہنچائے گا۔

باب ۱۳

ہر مذہب کے بانی کو تکلیفیں کیوں پُہنچائی گئیں۔ اور کس کے حکم سے یہ تکلیفیں پہونچی۔ جب خدا کریم و عادل ہے تو اس نے اس کو نیکی کا بدلہ بُرائی سے کیوں دیا۔

باب ۱۴

قیامت کیا ہے۔ اس کے امکان کا کیا ثبوت ہے اور اگر ممکن ہے تو اب تک کیوں نہیں ہوئی اور کب ہوگی۔ مرنے والوں کی روحیں اس وقت تک بہشت میں پہنچی یا نہیں۔ اگر نہیں پہونچیں تو اس وقت کہاں رہتی ہیں۔ اوران کے اعمال کا فیصلہ کب تک زیر تجویز رہیگا۔

باب ۱۵

روح کیا چیز ہے اور اس کا خاصہ کیا ہے۔ اوران روحوں کے علاوہ جو اب تک انسانی پیکر میں پہنچ چکی ہیں، کچھ روحیں باقی ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو کہاں رہتی ہیں۔

باب ۱۶

کیا روحیں اب بھی پیدا کی جائیں گی۔ اور روح کا میلان نیکی کی طرف ہوتا ہے یا بدی کی طرف۔ یا اس کو جسم نیک و بد بنا دیتا ہے۔ جب خدا نیکی کو پسند کرتا ہے اور روح کو نیک بناتا ہے تو وہ اس کی مرضی کے خلاف کیوں بُرے افعال کرتی ہے۔

باب ۱۷

عقل روح کے ساتھ رہتی ہے یا روح کے جسم میں داخل ہونے کے بعد اس کو راستہ بتانے آتی ہے۔

باب ۱۸

خدا نے اب تک شیطان کو اِس کے افعال بد پر سزا کیوں نہیں دی تاکہ انسان گناہ سے بچ جاتا۔

باب ۱۹

خدا نے لفظ کن سے عالم کو کیوں کر پیدا کیا۔ اگر اس سے لفظ صادر ہو سکتا ہے تو وہ عام انسانوں کی طرح ہے اس لئے انسان کی طرح اس کے لئے حدوث و فنا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جب خدا نے کن کہا تو سُننے والا کون تھا۔ اگر سُننے والا کوئی نہیں تھا تو کُن کا خطاب کس سے ہُوا۔ خالی مکان میں بولنے والے انسان کو بے وقوف کہا جاتا ہے اس لئے خُدا کو بھی بے وقوف کہنا چاہیے کہ بے مخاطب خطاب کر رہا ہے۔

باب ۲۰

خدا اگر عبادت کا محتاج نہیں ہے تو اس نے کیوں عبادت کا حکم دیا۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس، جہاد کے واجب ہونے میں کیا فلسفہ ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پانچ وقتوں کے بجائے تین وقتوں کی نماز واجب ہوتی۔ پھر خدا نے پانچ وقتوں کی نماز کیوں واجب کی۔

باب ۲۱

بآوازِ بلند عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ خداوند عالم دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔ اور اگر اس کا سُننا زور زور سے پکارنے پر موقوف ہے تو وہ خدا کہلانے کا مستحق نہیں ہے کیونکہ جو بلند آواز کا محتاج ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

باب ۲۲

وضو۔ غسل۔ اور تیمم کے واجب ہونے کا فلسفہ

باب ۲۳

استغفار

کیا چاند، سورج، ستاروں وغیرہ کو خدا نے بنایا ہے اور ان کا بنانیوالا واحد ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چند فاعلوں نے مل کر انہیں بنایا ہو، خدا کے وجود اور اس کی توحید پر کیا دلیل ہے۔ ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ مادہ نے خود ترقی کر کے موجودہ عالم کی صورت اختیار کی ہو۔ اس لئے وہی خالقِ مخلوقات کہلانے کا مستحق ہے

چاند، سورج، زمین، عقل، روح، مادہ، آسمان، ستارے، وغیرہ سب اُسی کے
دست قدرت کے بنائے ہوئے ہیں جس کی ذات انسانی مبلغ علم سے بالاتر ہے
اس میں شک نہیں کہ فلاسفران عالم کے محیر العقول اصول اور اشراقیت میں
ڈوبے ہوئے قوانین اس ہستی کا سُراغ کماحقہ نہ لگا سکے۔ تاہم انسانی ذہن کی
کمزوری اور علم اکتسابی کے نقائص سے یہ رائے قایم کرنا غلطی ہے کہ ہماری
معلومات کے ماوری کوئی شے نہیں ہے۔ دُنیائے انسانی کی ابتدا سے ابتک

کوئی فلسفی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلسفہ اور سائنس اس حد تک ترقی کرچکا جس کے بعد ان کے لئے کوئی منزل ارتقا باقی نہیں۔ اس لئے سرسری نظر ڈال کر مادہ کو مبدء حقیقی قرار دینا اصولی غلطی ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ مادہ مبدء عالم ہے۔ اور قوت ارتقا اس میں خود بیدا ہوگئی ہے۔ اگر خدا کے وجود سے اس بنا پر انکار ہے کہ محسوس نہیں ہوتا اور جو چیز محسوس نہیں ہوتی اُس کے وجود کا عقل یقین نہیں کرتی۔ جیسا کہ کرامت حسین صاحب جج الہ آباد اور بعض دیگر حکما متقدمین و متاخرین نے کہا ہے تو اس کلیہ کے برخلاف بہت زیادہ دلیلوں کا انبار موجود ہے جن کا انکار ناممکن ہے۔

مادّہ غیر محسوس شئے ہے

دُنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جو مادّہ کے وجود کا مُنکر ہو۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، جینی، دہریہ سب مادّہ کو تسلیم کرتے ہیں، اگرچہ اس کی حقیقت میں ارباب مذاہب اور فلاسفران عالم مختلف الخیال ہیں۔ لیکن وجود سے مُنکر نہیں اب مجھے یہ دریافت کرنے کا حق حاصل ہے کہ مادّہ کو کس نے محسوس کیا، کیونکہ احساس پانچ چیزوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے، آنکھ، کان، ناک، زبان، جلد۔

(۱) آنکھ مادّہ کو نہیں دیکھ سکتی کیونکہ اہل فلسفہ کا اس پر اتفاق ہے کہ آنکھ روشنی اور رنگ کو دیکھتی ہے۔ آپ اگر کسی دیوار ار کو دیکھنا چاہیں تو دو چیزیں نظر آئیں گی۔ ایک وہ روشنی جو آنکھ سے دیوار تک پھیلی ہوئی ہے۔ دوسرے وہ رنگ

جو دیوار کی سطح پر قایم ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ رنگ کے اُس طرف کی شے آپ کو نظر آے۔ عام اس سے کہ متقدمین اہل فلسفہ کی بنا پر آنکھ سے نکلی ہوئی شعاع سطح دیوار پر مانیں یا اہل سائنس کے نظریہ کی بنا پر اس امر کے قائل ہوں کہ دیوار کا عکس آنکھ میں پڑتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مادہ نہ روشنی ہے نہ رنگ بلکہ ان دونوں کا حامل ہے۔ اس لئے آنکھ کسی طرح مادّہ کو نہیں دیکھ سکتی۔

(۲) کان مادّہ کو محسوس نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ صرف آواز کو محسوس کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مادّہ آواز نہیں ہے بلکہ آواز مادہ سے پیدا ہوتی ہے۔

(۳) ناک مادّہ کو محسوس نہیں کر سکتی کیونکہ وہ خوشبو اور بدبو کو محسوس کرتی ہے اور مادّہ نہ خوشبو ہے نہ بدبو۔ بلکہ ان دونوں کا بار اُٹھانے والا ہے۔

(۴) زبان مادّہ کو محسوس نہیں کر سکتی۔ کیونکہ وہ ذائقہ مثلاً کھٹاس، مٹھاس وغیرہ کو چکھتی ہے، اور مادہ کسی ذائقہ کا نام نہیں ہے، نہ اس کو مٹھاس کہہ سکتے ہیں اور نہ کھٹاس، بلکہ وہ تمام ذائقوں کا محل ہے۔

(۵) جِلد مادّہ کو محسوس نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ سردی، گرمی، سختی، نرمی، کو محسوس کرتی ہے۔ اور مادہ سختی، نرمی، سردی، گرمی نہیں ہے بلکہ ان سب کا حامل ہے۔

میرے اس بیان سے واضح ہے کہ مادہ کسی طرح محسوس نہیں ہو سکتا، اِس نظریہ کی بنا پر کہ غیر محسوس کے وجود کا یقین نہیں ہوتا، ماننا پڑیگا کہ مادہ کے وجود کا یقین نہ ہو۔ حالانکہ دُنیائے انسانی کی کوئی فرد ایسی نہیں جو مادّہ کے وجود کی منکر ہو۔

مادہ انتہائی کثافت کے باوجود محسوس نہیں ہوتا صرف آثار سے اس کو پہچانتے
ہیں. تو خالق مادہ جو انتہائی لطافت میں ہے کیونکر محسوس ہو سکتا ہے۔ وہ بھی مادہ
کی طرح آثار سے پہچانا جاتا ہے۔

فلسفہ اور سائنس کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ غیب پر ایمان لایا جائے

میرے خیال ناقص میں فلسفہ اور سائنس
کی پہلی اور اہم تعلیم یہ ہے کہ غیر محسوس
اشیاء یعنی غیب پر ایمان لایا جائے

فلاسفران یونان کے نزدیک نو آسمان اور دس عقلیں ہیں. جن کے واسطے
ہماری مادی دنیا پیدا کی گئی. افلاطون کے نظریہ کے بنا پر اس عالم مادی کے علاوہ
ایک اور عالم روحانی ہے. وہ اصل ہے یہ نقل. جو اس عالم میں ہوتا ہے وہ پہلے
اس عالم میں ہوتا ہے. یہاں کے تغیرات کا صحیح سبب وہ ہی عالم روحانی ہے۔

روح کے وجود پر تمام فلسفی متفق ہیں. ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اسکی حقیقت
کیا ہے. جوہر ہے یا عرض، مرکب ہے یا بسیط. اور نہ اس کا خیال ہے کہ مختلف الخیال
فلسفیوں میں کون حق پر ہے. حقیقت کچھ ہو لیکن روح کے وجود سے کسی کو انکار نہیں

کیا ان سب چیزوں کو کسی نے آنکھ سے دیکھا ہے. درحقیقت آسمان، عقل، روح
عالم روحانی، کسی نے نہیں دیکھے صرف قیاس اور استدلال سے ان کا علم ہوا ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ کا جزو اعظم ایمان بالغیب ہے. اگر ہم آج ایمان بالغیب
سے ہاتھ اٹھا لیں تو فلسفہ کا جزو اعظم فنا ہو جائے. غیر محسوس اشیاء پر ایمان لائے بغیر

انسان کو چارہ نہیں۔ مادہ، روح، عقل، فلک کا علم صرف عقل سے ہوتا ہے اسی طرح اِن کے خالق کا علم بھی عقل سے ہو سکتا ہے۔

مادّہ کا ثبوت

مادہ کا وجود اور حدوث قدرت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس لئے پہلے ان دونوں کا ثبوت ضروری ہے۔ تاکہ آسانی سے اس بُلند ہستی کے مقدس وجود پر دلیل قایم ہو سکے جو حواس خمسہ کی قید سے بَری ہے۔

دُنیا میں کوئی جسم نہیں جو مادّہ نہ رکھتا ہو عام اس سے کہ وہ فلکی ہو یا عنصری کیونکہ ہر جسم قابل تقسیم ہے۔ خواہ اس کو بظاہر آلات کے ذریعہ سے کاٹ سکیں یا نہ کاٹ سکیں لیکن یہ عقل ضرور تسلیم کرتی ہے کہ چاند کا مشرقی حصّہ مغربی حصّہ سے مُمتاز ہے۔ اور اوپری حصّہ اندرونی حصّہ سے علٰیحدہ ہے۔ سورج کا $\frac{1}{2}$ $\frac{1}{4}$ $\frac{1}{8}$ حصّہ کل کا غیر ہے۔ اگر ہم کسی کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تو تقسیم سے کاغذکی اصلی صورت مٹ جائے گی۔ اور چند نئی صورتیں پیدا ہوں گی۔ صورت جسمیہ اس تقسیم کو قبول نہیں کر سکتی کیونکہ وہ تقسیم کے وقت معدوم ہو جاتی ہے۔ اس لئے تقسیم قبول کرنے والے جسم میں کوئی دوسری شے ہو گی۔ اُسی کا نام مادّہ ہے۔

مادّہ حادث ہے

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادہ حادث ہے یا قدیم اگر ہم اس کو قدیم تسلیم کریں تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں مستغنی ہونے کی وجہ سے خالق یا خالق کا شریک ہے۔ لیکن اِس کے

حادث ہونے کی دلیل آجتک رد نہ ہو سکی۔ خدا کے وجود کا دار و مدار مادہ کے حدوث پر ہے۔ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ غیر محسوس شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے۔ مادہ کے لئے حرکت یا سکون کا ہونا ضروری ہے یہی اس کے رہنما آثار ہیں۔ یہ طے شدہ ہے کہ مادہ جب سے ہے حرکت یا سکون کے لباس سے علیحدہ نہیں ہوا یکے بعد دیگرے یہ مادہ پر طاری ہوتے ہیں اور حرکت و سکون حادث ہیں۔ کیونکہ حرکت کسی شے کے تدریجاً وجود میں آنے کو کہتے ہیں اس لئے حدوث اس کی حقیقت میں داخل ہے۔ جب حرکت حادث ہے تو سکون کا حادث ہونا بھی لازمی ہے کیونکہ ہر متحرک حرکت کے وقت سکون کی قابلیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر ساکن سکون کے وقت حرکت کی قابلیت رکھتا ہے اگر سکون کو قدیم مانا جائے تو حرکت اس کی قایم مقام نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ حرکت کے لئے لازمی امر ہے کہ وہ سکون کی قایم مقامی کر سکے اس لئے یہ ماننا ہوگا کہ دونوں حدوث میں متوازن ہیں۔

اب بآسانی اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ مادہ حادث ہے کیونکہ اگر مادہ کو قدیم تسلیم کیا جائے اور حرکت و سکون کو جو اس کیلئے لازم ہیں حادث مانا جائے تو قدیم و حادث کے درمیان لزوم کا ربط نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ لزوم کا مقتضے یہ ہے کہ قدیم و حادث میں ایک لمحہ کے لئے جدائی نہ ہو۔ اب دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں حرکت و سکون کو قدیم مانا جائے یا مادہ کو حادث تسلیم کیا جائے۔ حرکت و سکون

کو میں دلیل سے ثابت کر چکا ہوں کہ حادث ہیں۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مادہ بھی حادث ہے۔ ورنہ کوئی صورت مادہ اور حرکت وسکون کے درمیان ربط کی نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مادہ حرکت وسکون کے بغیر پایا جاتا تھا۔ کیونکہ کوئی شے اپنی صفت لازمی کے بغیر نہیں پائی جا سکتی۔ یہ ناممکن ہے کہ نمکین سے پہلے نمک اور مٹھاس سے پہلے مٹھائی موجود ہو۔ جب سے نمک ہے اسی وقت سے اس میں نمکینی ہے۔ جب سے مٹھائی ہے اُسی وقت سے اُس میں مٹھاس ہے۔ اسی طرح جب سے مادہ ہے اسی وقت سے اس میں حرکت وسکون ہیں۔ اگر مادہ کو قدیم فرض کیا جائے تو اس کو اپنی صفت لازم یعنی حرکت وسکون کو جو حادث ہیں چھوڑنا پڑیگا اور یہ محال ہے کہ کوئی شے اپنی صفت لازم کو چھوڑ کر قائم رہے۔

خدا کے وجود کی دلیل

مادہ کے حادث ثابت ہونے کے بعد قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عدم سے وجود میں خود کیونکر آیا۔ جب ایک شے معدوم ہے تو اس نے اپنی ذات کو کیونکر پیدا کیا حالانکہ پیدا کرنا ایک فعل ہے جو فاعل کی موجودگی کو بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ معدوم وجود کا تقاضا بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ ماننا ہوگا کہ مادہ کو کسی ایسی ذات نے اپنی مصلحت سے پیدا کیا ہے جو ازلی ہے۔ ورنہ دور یا تسلسل لازم آئے گا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ امر بھی ناقابل اغماض ہے کہ مادہ ذی شعور نہیں ہے۔ اور جب مادہ ذی شعور نہیں ہے تو اس نے انسان کو ذی شعور کیونکر

پیدا کیا۔

پھر انسان کے بنانے میں جو ترتیب قایم کی ہے اس کی تعریف علمائے
سرجری ہی کر سکتے۔ اقلیم بدن میں تین عضو شریف ترین مانے گئے ہیں۔ دل،
دماغ، جگر، دل سب سے زیادہ شریف ہے۔ اس لئے قدرت نے اس کی
سب سے زیادہ حفاظت کی ہے۔ درمیان جسم میں رکھا اور ہڈیوں کا مضبوط
حصار اس کے چاروں طرف کھینچ دیا۔ تاکہ خارجی صدموں کے اثر سے محفوظ رہے
دماغ کے لئے بھی لطیف وکثیف پردہ تانکر ہڈیوں کا مضبوط کر دی گنبد بنا دیا
کیونکہ مثلث و مربع دیگر اشکال کی بہ نسبت کر دی شکل صدموں سے زیادہ
محفوظ رہتی ہے۔ اسی طرح جگر کو ہڈیوں کے پہلو میں جگہ دی۔ اگر میں جسم
انسانی کے ایک ایک عضو کی ترتیب کی خوبی اپنی ناقص معلومات کے موافق
بیان کروں تو یقین ہے کہ ایک مطول کتاب تیار ہو گی چہ جائیکہ ان خوبیوں
کو دہراؤں جن کو علمائے سرجری نے بیان کیا ہے۔

حال ہی میں ڈاکٹروں نے بدن انسانی کے موجودہ نظام کی ترتیب بدلکر
ناکامیابی کی صورت دیکھی۔ انہیں پہلے یہ خیال ہوا کہ بدن انسانی میں تلّی کی
کوئی ضرورت نہیں ہے اس لئے بعض مریضوں کی تلّی نکالی۔ وہ مواد جو تلّی میں جمع
ہوتے تھے سمی صورت اختیار کرنے کے بعد تمام جسم میں دوڑ گئے۔ جس سے کئی مریض
تلف ہو گئے۔ پھر ڈاکٹروں کو یہ خیال ہوا کہ پتہ بے کار عضو ہے۔ اس لئے اس کو

علیحدہ کیا جائے۔ اس کو علیحدہ کر کے تجربہ کیا گیا۔

اس کے اندر جمع ہونے والے مواد نے بھی سمی صورت اختیار کر کے تمام جسم کو خراب کر دیا جس سے ان مشق شدہ مریضوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے یہ کوشش کی کہ معدہ کو نکال لیا جائے۔ اس میں بھی وہ ناکامیاب ہوئے آخر مجبوراً یہ رائے قایم کرنی پڑی۔ کہ موجودہ نظام بدنی میں جو سائنس کے اصول کے مطابق قایم کیا گیا ہے۔ تبدیلی ناممکن ہے۔ اب وہی سوال ہوتا ہے کہ مادہ نے جو ذی شعور نہیں اتنی مضبوط ترتیب کیونکر قایم کی۔ جو ایک عالم الغیب ہی کر سکتا ہے علمائے طبعیات نے بیان کیا ہے کہ کائنات عالم کی موجودہ ترتیب سے بہتر ترتیب قایم نہیں ہو سکتی۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ریلوں کی علیحدہ علیحدہ لائنیں ہیں۔ چلانے والے بھی علیحدہ ہیں پھر سنگل بھی موجود ہے۔ گارڈ کو اختیار ہے کہ خطرہ کے وقت فوراً روک دے۔ ہر ایک اسٹیشن پر ٹیلیفون اور تار لگے ہوئے ہیں۔ گاڑی کے چھوٹنے کے اوقات معین ہیں۔ ان تمام انتظامات کے باوجود گاڑیاں لڑ جاتی ہیں۔ ہزاروں مسافروں کا خون ناحق مدبر گارڈوں اور ڈرائیوروں کے سر ہوتا ہے۔ جب انسان ذی شعور اور مدبر ہوتے ہوئے دو گاڑیوں کے لڑنے کا انتظام نہیں کر سکتا تو مادہ جو غیر ذی شعور ہے کیونکر اس وسیع عالم کی روک تھام کر سکتا ہے۔ آج تک کبھی نہیں دیکھا گیا کہ ایک سیارہ کا تصادم دوسرے سیارے سے ہوا ہو نہ کبھی چاند آفتاب سے ٹکرایا۔

نہ آفتاب زمین سے۔ نہ زحل مشتری سے متصادم ہوا نہ مشتری دوسرے سیاروں سے۔ ہر سیارہ اپنے دائرہ پر گھوم رہا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی سیارہ اپنے دائرہ سیر سے ہٹ کر دوسرے کے دائرہ سیر پر چلا جائے۔ عالم کا موجودہ نظام بتاتا ہے کہ جس کے دست قدرت میں اس کی عنان اختیار ہے وہ انتہائی تدبیر کا مالک ہے۔

دو خدا نہیں ہو سکتے

مسئلہ توحید وہ ہے جس میں اکابر اہل فلسفہ کے قدم ڈگمگائے اور ارباب تحقیق کی بلند پروازی خیال تھک تھک کے گر گئی جہاں وہ فلسفی ہیں کہ مرکز توحید سے آگے بڑھ گئے یا پیچھے رہ گئے۔ وہاں وہ بھی ہیں جو مرکز حقیقی پر قایم رہے۔

متکلمین اور فلاسفران موحدین نے بڑی بڑی دلیلیں توحید پر قایم کی ہیں جن کو صرف اہل علم اور وہ بھی علم فلسفہ کے ماہر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے میں آسان الفاظ میں صرف "دو" دلیلیں پیش کرتا ہوں جو دیکھنے میں سُبک اور تردید میں گراں ہیں۔

(۱) اگر دو خدا مان لئے جائیں تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ ایک خدا تمام عالم کا نظام دوسرے خدا کی امداد کے بغیر کر سکتا ہے یا نہیں۔ اگر کر سکتا ہے تو دوسرا خدا بے کار ہے اور جس کی ذات بیکار و عبث ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا اگر دوسرے کی امداد کے بغیر نہیں کر سکتا تو وہ محتاج ہے اور جو محتاج ہے

وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے صرف ایک ہی خدا ہو سکتا ہے۔

(۲) اگر دو خدا ہوں گے تو خدائی کمالات میں دونوں ایک دوسرے کے نظیر ہوں گے یا نہ ہوں گے۔ اگر دونوں ایک سے ہوں گے تو دونوں ناقص ہونگے کیونکہ کمال حقیقی وہ ہے جس کی مثال و نظیر نہ ہو۔ جب ایک دوسرے کے نظیر ہیں تو دونوں حقیقی کمال سے گرے ہوئے ہیں۔ اس لئے ایک بھی خدا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کمالات کے اعتبار سے مساوی نہیں ہیں۔ تو جو بڑھا ہوا ہے وہ خدا ہے اور جو کم ہے وہ خدا نہیں۔ اس لئے ہر صورت میں ایک ہی خدا رہے گا۔
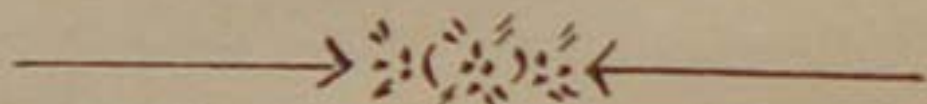
باب (۲)

اگر خدا ایذا رسانی کو روا نہیں رکھتا تو دنیا میں انسان کو طرح طرح کی تکلیفیں کیوں پہونچتی ہیں۔ کیا انسان ہی کی تکلیف پر نظامِ تمدن موقوف ہے

اس بحث کے چھیڑنے سے قبل کہ خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ اس کی مخلوق مصائب کی زنجیروں میں جکڑ جائے اور ہمیشہ تکلیفیں اٹھاتی رہے یا نہیں ہم کو یہ بتا دینا چاہیے کہ تکلیف کے قسم کی ہوتی ہے اور کونسی تکلیف عقلائے عالم کے نزدیک ممدوح ہے اور کس لئے ممدوح ہے۔

تکلیف دو قسم کی ہوتی ہے۔ فطری اور غیر فطری۔ تکلیف فطری وہ ہے جس کے بعد جائز راحت ہو۔ اور تکلیف غیر فطری وہ ہے جس کے بعد جائز راحت نہ ہو۔ تکلیف فطری عقلائے عالم کے نزدیک ممدوح ہے کیونکہ اس سے منفعت عقلائی حاصل ہوتی ہے۔

قلی دن بھر بوجھ اٹھاتا ہے۔ پلہ دار بار برداری کرتا ہے۔ سپاہی سر دراتوں

میں پہرا دیتا ہے۔ جج دن کے دو بجے مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے۔ کیوں صرف اس
لئے کہ نتیجہ میں راحت نصیب ہوتی ہے۔ اگر راحت ملنے کا یقین نہ ہو۔ تو کوئی
انسان تکلیف اٹھانے کو تیار نہیں ہوسکتا۔ ملازم یہ جانتے ہیں کہ اس کی خدمت کا
اجر نہ ملے گا۔ ملازمت سے دست بردار ہو جائے گا۔ قلی یہ سمجھتے ہیں کہ اسکی باربرداری
کی مزدوری وصول نہ ہوگی۔ اسباب کو سر پر سے پھینک دیگا۔ کیونکہ تکلیف غیر فطری
کو ہر شخص بُرا جانتا ہے۔ نیز تکلیف فطری کے بغیر تمدن قایم نہیں رہ سکتا۔
اگر مرد شادی کی کلفتیں نہ اُٹھائے۔ اور عورت بیاہ کی مصیبت نہ جھیلے تو نسل انسانی
کا خاتمہ ہو جائے۔ حیوانات بھی اپنی بقائے نوع و نسل کی خاطر ان ہی قیود فطریہ
کے پابند ہیں۔ اسی طرح اگر کسی گھر میں بزرگ و خورد تسلیم نہ کیا جائے۔ تو تدبیر منزل
ناممکن ہے۔ حالانکہ بزرگی و خوردی میں تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس
کے مافوق سیاست و تمدن ملکی ہے جس میں بادشاہ کو ذمہ دار ہونے کی حیثیت
سے تکلیفیں اُٹھانی ہوتی ہیں۔ رعایا بھی انقیاد کا بار گراں اپنے سر پر رکھ لیتی ہے
اگر بادشاہ اپنی تکلیفوں کے لحاظ سے سلطنت سے استعفا دے اور رعایا غلامی کی
کلفتوں کو برداشت نہ کرے۔ تو نظام عالم درہم و برہم ہو جائے۔ اب صرف
دیکھنا اس امر کا ہے کہ خدائی تکالیف فطری ہیں یا غیر فطری۔

میں اپنے بیان میں تکلیف فطری کے دو معیار عرض کر چکا ہوں۔
(۱) نتیجہ میں جائز راحت ہو۔ (۲) بغیر اس کے نوع انسانی اور نظام

عالم قایم نہ رہ سکے۔

دونوں معیاروں کی بنا پر خدائی تکالیف فطری ہیں۔ خدا کی طرف سے کوئی
تکلیف انسان کو ایسی نہیں دی گئی جس کے نتیجہ میں راحت نہ ہو۔ راحت کس قد
ہے اور کب حاصل ہوگی۔ یہ دوسرا سوال ہے لیکن اس کا حاصل ہونا ضروری ہے
اگر خدائی احکام عام اس سے کہ جزی ہو یا کلی مسدود کر دئے جائیں تو نظام عالم
بہت جلد ختم ہو جائے۔ فرض کیجئے اگر آج مسئلہ ازدواج کو رد کر دیا جائے تو زیادہ سے
زیادہ سو برس کے اندر نسل انسانی منقطع ہو جائے گی۔ یا پیدائش بھی ہوئی لیکن
ماں باپ نے تکلیف کی وجہ سے قانون تربیت پر عمل نہیں کیا۔ تب بھی نوع انسا
کا خاتمہ ہوگا۔ یا مسئلہ میراث کو نہ مانا جائے تو ظاہر ہے کہ کس قدر ظلم کا امکان
ہے۔ کس کس کے حق تلف ہوں گے۔

اسی طرح اگر اولاد ماں باپ کی اطاعت سے انکار کرے تو خانہ بربادی
ہوگی۔ یا رعایا اپنے بادشاہ کے جائز قوانین کو نہ مانے تو عالم میں فساد ہوگا
یا اُستاد کے حکم کو شاگرد ٹھکرا دے تو نظام تعلیم بگڑ جائیگا۔ مذہب ان ہی قوانین
فطریہ کو لیکر آتا ہے۔ جن کا دوسرا نام تکلیف ہے۔ اگر خدا کو تسلیم نہ کیا جائے تو
بھی نظام عالم ان قوانین فطریہ کی پابندی کا محتاج ہے۔ دہریہ بھی ماں باپ کی
خدمت کرنا، دوستوں سے سلوک کرنا۔ بادشاہ کی جائز خدمت بجا لانا واجب ج
ہیں۔ ان ہی قوانین کو اگر مذہب اپنے الفاظ میں پیش کر دے تو کیا حرج ہے۔

خدا نے اُن ہی تکالیف کو مقرر کیا جو فطری طور سے انسان کے لئے ضروری تھیں۔ اتحاد۔ عدالت۔ مہربانی۔ سخاوت۔ صدق وغیرہ کو کون اچھا نہیں جانتا خدا نے اتحاد کو نماز جماعت کی صورت میں بدل دیا۔ ظاہر ہے کہ جب سب ایک جگہ جمع ہوں گے اور مصافحہ کریں گے تو یقین ہے کہ خلوص واتحاد میں ترقی ہو گی کیونکہ مصافحہ کرنے میں دو شخصوں کے ہاتھ ملتے ہیں۔ اور ہاتھ کی رگوں کا کنکشن دِل سے ہے۔ اس لئے ایک شخص کے قلب کی قوت برقیہ دوسرے کے دل تک بآسانی پہنچ جائے گی۔

اسی طرح چوری، ڈکیتی، قتل، ظلم، کذب، تہمت، غیبت، و دغا کو برا سمجھنا اور اُن کو ترک کرنا عام اس سے کہ مذہب اس بارے میں ہدایت کرے یا نہ کرے نظام عالم کی بقا کا سبب ہے، اس لئے مذہب نے وہ فریضہ انجام دیا۔ جو بنی نوع انسان کے ذمہ دار افراد کو نظام عالم کی بقا کے لئے انجام دینا چاہیئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انسان دہریہ ہونے کے باوجود، صدق، ہمدردی عدالت، عفت کو اچھا۔ اور زنا، چوری، ڈکیتی، ظلم، کذب، دغا کو برا جانتا ہے۔ اِسی طرح نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ کی پابندیاں جو اجنبی اور غیر ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ بقائے روحانیت اور نظام کے لئے ضروری ہیں۔

میں آیندہ باب میں ان کی مصلحت اور حقیقی علت اپنے علم کے مطابق بیان کروں گا۔ تب اس امر کا اندازہ ہو سکے گا کہ قانون مذہب جو تکلیف کے

نام سے موسوم ہے کس قدر نظام عالم کے لئے اہم شے ہے۔

رہا یہ امر کہ انسان بعض تکلیفیں قانون شکنی کر کے اُٹھاتا ہے۔ مثلاً زید قانون عدل کو توڑ کر بکر کو قتل کر دیتا ہے۔ حاکم اس کے لئے سزائے موت تجویز کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا ذمہ دار خود کرنے والا ہے نہ کہ خدا۔ ہاں مظلوم کا عوض اس کے ذمہ ہے۔ اگر آپ کو کسی سے محبت ہے وہ رات کو چوری کرے اور چھ ماہ کی عدالت سے سزا پا جائے تو اس میں آپ کا قصور نہیں ہے۔ قصور اُسی کا ہے جو مختلف نصیحتوں کے باوجود چوری سے باز نہ آیا۔ اس طرح اپنی پیدا کردہ تکلیفوں میں مُبتلا ہونے والے خُدا کی محبت اور مہربانی پر الزام نہیں لگا سکتے۔

باب ۳

شیطان کب اور کس نے اور کیوں پیدا کیا۔ اس کو بجز چند اہلِ مذہب دُنیا کی تمام قومیں کیوں تسلیم نہیں کرتیں ⁂

شیطان کسے کہتے ہیں

اِس سوال کے تین جز ہیں۔ لیکن تینوں جزوں کا جواب دینے سے پہلے اس امر کا بتانا ضروری ہے کہ شیطان کسے کہتے ہیں۔ تاکہ شبہات خود بخود برطرف ہو جائیں۔ شیطان اس قوت کا نام ہے جو نیکیوں سے روکے۔ اب فاضل معترض دُنیا میں صرف ایک ہی فرد ایسی پیش کر دیں جو اس قوت کی منکر ہو۔

دُنیا کی تمام قومیں شیطان کے وجود کو تسلیم کرتی ہیں

جینی، ہندو، دہریہ، پارسی، عیسائی، مُسلمانوں میں کون شخص ہے جو اس کا قائل نہیں۔ روزمرہ کا تجربہ ہے، کہ انسان گناہ کرتا ہے۔ خواہ کسی مذہب کا عقیدتمند ہو یا نہ ہو۔ میں ملت و مذہب سے اغماض کرتا ہوا دریافت کرتا ہوں کہ عالم میں وہ کون قوم ہے جس میں چور

زانی، ڈاکو، بدمعاش، کاذب، دغاباز، غاصب وغیرہ نہیں اور وہ کیا چیز ہے
جس نے ان گنہگاروں کو گناہ کی طرف رغبت دلائی۔ حالانکہ ان کی عقل خود
انہیں مجرم بتارہی تھی۔ اسی کا نام شیطان ہے۔ گو لفظ شیطان سے بعض اہلِ
مذہب اور دہریوں کو اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔ تاہم گناہ کی طرف رغبت دلانے
والی قوت ہے جس کی تعبیر قرآن اور انجیل وغیرہ نے شیطان سے کی ہے کسی کو
انکار نہیں ہوسکتا۔ شیطان کے وجود سے انکار کرنے کا حق اس شخص کو حاصل ہے
جس کے دامن عفت پر کبھی گناہ کے بدنما دھبہ نہ لگے ہوں۔ اور اس کی زندگی
ہمیشہ معصومانہ رہی ہو۔ لیکن اس کا انکار صرف اپنی ذات تک محدود رہیگا۔ ورنہ
دوسرے لوگوں کی نسبت جو برابر گناہ کرتے رہتے ہیں اس کو بھی شیطان کا وجود
تسلیم کرنا ہوگا۔ فرض کیجئے ہندوستان میں بتیس کروڑ انسان ہیں اگر ان میں ایک
معصوم نکل آیا تو اس کی عصمت سے شیطان کے وجود پر کیا اثر ہو سکتا ہے معصوم
یہ کہہ سکتا ہے کہ میری ذات شیطان سے پاک ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ بتیس
کروڑ آبادی شیطان سے منزہ ہے۔ کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ سرزمین ہندط
طرح کے گناہوں سے آلودہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا وجود عا
کی تمام قوموں کے لئے مسلّم ہے۔ ہاں اس میں اختلاف ہے کہ اس کی حقیقت
ہے لیکن کسی شے کی حقیقت معلوم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ موجود نہ
بے وقوف اور جاہل ترین انسان بھی اس کا انکار نہیں کرسکتا کہ ہر وقت

بنی آدم میں ایسی قوت موجود ہے جو اس کو ناجائز فائدہ اٹھانے کی طرف ابھارتی ہے۔ یہ کسی سے دریافت کرنے پر موقوف نہیں۔ کیونکہ شاید کوئی ایسا دن ہو جس میں کسی شخص کو اپنے نفس سے ناجائز قانون کے برخلاف جنگ نہ کرنی پڑتی ہو۔ لہذا ہر شخص اس بارے میں ذاتی تجربہ رکھتا ہے۔

شیطان کی حقیقت

شیطان کی حقیقت اور ماہیت میں عقلاء عالم مختلف الخیال ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ ناری مخلوق ہے جس کی تعبیر قوم جن سے کی جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک شریر انسان ہی شیطان ہے اہل فلسفہ کے نزدیک وہ قوت نفسی ہے جو انسان کو افعال بد کے ارتکاب پر برانگیختہ کرتی رہتی ہے۔ اس موضوع پر علمائے مذاہب اور اہل فلسفہ نے معرکۃ الآرا بحثیں کی ہیں۔ اور ہر ایک نے دوسرے کی تردید میں دلیلوں کا انبار لگا دیا ہے۔ اہل فلسفہ نے اس شیطان کا انکار کیا ہے۔ جو قوم جن سے بتایا جاتا ہے کیونکہ اُن کے نزدیک جن قوت متخیلہ کا نتیجہ ہے۔

اہل فلسفہ کے نزدیک جن کا وجود ناممکن ہے

وہ اس امر کو تسلیم نہیں کرتے کہ جن تنہا آگ سے مخلوق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اشیاء مادی کا وجود اعتدال مزاج پر موقوف ہے اور عناصر اربعہ میں سے کسی ایک عنصر سے اگر کوئی شے بنائی گئی تو مزاج قائم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مزاج عناصر اربعہ کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ جب چاروں عنصر مل کر ایک دوسرے کی

کیفیت پر اثرانداز ہوتے ہیں. آگ کی حرارت پانی کی برودت کو اور پانی کی
برودت آگ کی حرارت کو کم کرتی ہے تو اعتدال قایم ہوکر مرکب مادی تیار ہوتا
ہے. اس کے علاوہ ہر عنصر بسیط ہونے کی وجہ سے کردی ہے اس لئے وہ اپنی
صورت چھوڑکر دوسری صورت اس وقت اختیار کرسکتا ہے جب کوئی اس کے
طبعی اثرات کے برخلاف اثر ڈالنے والا ہو۔ عناصر اربعہ کی آمیزش میں ہر ایک عنصر
دوسرے عنصر کے طبعی اثرات کے برخلاف اثر ڈالتا ہے اس لئے کوئی مادی شے
اس وقت تک نہیں بن سکتی. جب تک عناصر اربعہ کی آمیزش نہ ہو۔

شیطان کے متعلق خاکسار سبزواری کی رائے

علمائے مذاہب اور اہل فلسفہ کے مقولات
اوران کے جید استدلالوں کے سامنے اپنی
ناچیز رائے پیش کرنا. اوران کی تردید کے لئے
قلم اُٹھانا خصوصاً جبکہ بقول حریری "دنیا مردہ پرست" ہے کسی طرح میرے لئے
مناسب نہ تھا. تاہم یہ سمجھتے ہوئے "نحن رجال وھم رجال ہم بھی آدمی ہیں وہ
بھی آدمی تھے" اپنا خیال ناقص پیش کرتا ہوں کہ حقیقت بے نقاب ہوجائے اور
فاضل دوست، معزز بزرگ، اور لایق شاگرد جو ہمیشہ میری ذاتی رائے کے طالب
رہتے ہیں ناراض نہ ہوں۔

شیطان جنس، نوع، علم نہیں ہے جیسے حیوان، انسان، زید تاکہ اِس کی
حقیقت اور ماہیت معلوم کی جائے۔ بلکہ یہ عرض یعنی صفت خارجی ہے. جو کسی

کی ذات کو ہمیشہ کے لئے لازم نہیں۔ اگر شیطان، جنس، نوع یا علم ہوتا تو اس کی حقیقت کے متعلق بحثیں مناسب ہوتیں۔ علمائے مذاہب اور اہل فلسفہ نے اس پر غور کرنے سے قبل کہ شیطان کسی شے کا جزء ذاتی ہے یا صفت خارجی مختلف نظریہ قایم کئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک حقیقت منکشف نہ ہوسکی کتابت، ہنسی، خوشی، رنج، غصہ، محبت، عداوت جس طرح صفت خارجی ہیں۔ اسی طرح شیطنت بھی صفت خارجی ہے، جو لکھنے کا کام کرے گا وہ کاتب، جو ہنسے گا وہ ضاحک، جس کے چہرہ پر آثار مسرت ظاہر ہوں گے وہ خوش، جس کی پیشانی پر بل پڑیں گے وہ رنجیدہ، جس کے افعال سے دوستی کے آثار نمودار ہونگے وہ دوست، جس کے حرکات سے دشمنی ٹپکتی ہوگی وہ دشمن، اسی طرح جس کے اخلاق، افعال یا اقوال میں گناہ کا شائبہ ہوگا وہ شیطان ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ کاتب کی حقیقت کیا ہے۔ تو یہ کہنا ہوگا کہ جو شخص صفت کتابت رکھتا ہے وہ کاتب ہے۔ اسی طرح اس سوال کے جواب میں کہ شیطان کی حقیقت کیا ہے یہ ہی کہنا ہوگا کہ جو شخص صفت شیطنت رکھتا ہے وہ شیطان ہے۔ عام اس سے کہ جن ہو یا انسان۔

شیطان کے متعلق قرآن کا نظریہ

افعال بد اور اخلاق فاسدہ کا تعلق کسی قوم اور ملت سے مخصوص نہیں ہے۔ جس طرح ہندو، عیسائی، یہودی چوری کرتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی اس فعل بد کے

مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے شیطان بھی کسی قوم وملت سے نہ ہوگا۔ بلکہ کسی مذہب اور قوم کے ہر اُس فرد کو شیطان کہیں گے جو افعال بد کرتا ہے۔ یہی قرآن کا نظریہ ہے یوسوس فی صدور النّاس من الجنۃ والناس شیطان کسی خاص ذات کا نام نہیں ہے ورنہ خدا اس کی شخصیت اور قوم وقبیلہ بتانے کی بجائے یہ نہ فرماتا کہ جو آدمیوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے وہ قوم انسان اور جن سے ہے۔ قرآن نے کسی ذات یا قوم کی تخصیص نہیں کی۔ اگر شیطان کسی مخصوص ذات کا نام ہوتا تو مہربان خُدا کو چاہیئے تھا کہ وہ اس کا پورا پتہ اس کی شناخت قوم وقبیلہ کا نام ظاہر کرتا۔ قرآن نہ یہ کہتا ہے کہ شیطان مُسلمان ہے نہ یہ کہتا ہے کہ وہ ہندو یا عیسائی ہے۔ نہ یہ کہتا ہے کہ وہ مشرک یا دہریہ ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ وہ بلاتخصیص قوم وملت بنی نوع انسان اور بنی جان سے ہے اس سے میرے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ جس سے شیطنت آمیز افعال صادر ہونگے وہ شیطان ہے (لغت صراح) کل عات متمرد من الجن والانس والدواب فھو شیطان۔ یعنی ہر سرکش جن، انسان، جانور شیطان ہے۔ آدم سے جس نے...

جنات کا وجود ممکن ہے

اہل فلسفہ نے اس شیطان کا انکار کیا ہے جو قوم جن سے ہے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں جن ناری مخلوق ہے اور کوئی مادی شے ایک عنصر سے نہیں بن سکتی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر آیا ہوں۔ میرے نزدیک یہ نظریہ غلط ہے کیونکہ اس کا دار و مدار دو امروں پر ہے (۱) ایک عنصر میں چاروں کیفیتیں متضاد ہونے کی وجہ سے نہیں

پائی جاسکتیں۔ حرارت برودت کے متضاد ہے رطوبت یبوست کے۔ ایک عنصر میں ان میں سے صرف دو کیفیتیں پائی جاسکتی ہیں۔ اس لئے مزاج جو اصل اصول خلقت ہے قایم نہیں ہوسکتا۔

(۲) کوئی عنصر اپنی شکل طبعی کو جب تک اس پر قاسر اثر انداز نہ ہو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور ظاہر ہے ایک عنصر میں قسر نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ دونوں دلیلیں کمزور ہیں۔

(۱) ہوسکتا ہے کہ ایک عنصر پر چاروں متضاد کیفیتیں طاری ہوں دو ذاتی اور دو عارضی اور ان سے مزاج قایم ہوجائے۔ پانی بالذات ٹھنڈا تسلیم کیا گیا ہے لیکن عارضی طور سے گرم کرنے سے معتدل ہوجاتا ہے اسی طرح ہوسکتا ہے کہ قوت قاسرہ ربانیہ ایک عنصر کو چاروں کیفیتیں طاری کرکے معتدل بنادے اعتدال کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ حرارت و یبوست جس عنصر کے لئے ضروری ہیں اس پر برودت و رطوبت عارض ہوجائیں یا حرارت و یبوست اپنے محل سے ہلکی ہوجائیں۔ اور یہ دونوں امر قوت قاسرہ ربانیہ کے لئے ممکن ہیں۔

(۲) ایک عنصر میں قسر اس وقت نہیں ہوسکتا جبکہ قوت قاسرہ ربانیہ کو دخل نہ ہو اور جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں اور یہ ناممکن بھی نہیں ہے کہ قوت قاسرہ ربانیہ اپنے قسر سے ایک عنصر پر چاروں کیفیتیں کردے تو لامحالہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

اس کو اپنی شکل طبعی چھوڑنی پڑے گی۔ رہا یہ امر کہ متضاد کیفیات کا اجتماع ایک محل پر فی نفسہ محال ہے تو یہ مسلّمہ ہے کہ متضاد کیفیات مساوی طاقت ہونے کی صورت میں ایک محل پر جمع نہیں ہو سکتیں، اور یہاں ہم یہ نہیں مانتے کہ ان کی طاقت مساوی ہے۔ میری اب تک تقریر اس امر پر مبنی تھی کہ مادیات کے لئے مزاج کی شرط ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ قوت قاسرہ ربانیہ بلا مزاج قایم کئے ہوئے عنصر کی شکل طبعی بدل کر اس پر روح کا فیضان کرے۔

جنّات کے امکان کا دوسرا پہلو

یہ بھی ممکن ہے کہ جن عناصر اربعہ سے مرکّب ہو اور اس میں جزناری زیادہ ہو۔ جس طرح انسان عناصر اربعہ سے مرکّب ہے اور اس میں جز خاکی زیادہ ہے اور جزناری پر کچھ آثار مخصوص بھی مرتب ہوں جیسے انسان کے جز خاکی پر آثار مخصوص مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر شے کی تین قسمیں ہیں۔ واجب، ممکن، ممتنع۔ واجب اور ممتنع کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ اگر کسی شے کے واجب یا ممتنع ہونے پر دلیل نہ ہو تو وہ ممکن ہے کیونکہ جس شے کا وجود یا عدم ضروری نہ ہو گا وہ ممکن ہو گی۔ جن کے محال و ممتنع ہونے پر آج تک کوئی دلیل قایم نہیں ہو سکی۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ اس کا وجود ممکن ہے۔

شیطان کا وجود کب سے ہے

شیطان کا وجود کب سے ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہ کہنا کافی ہے کہ جب سے

گناہ کرنے والی مخلوق دُنیا میں آباد ہوئی۔ لیکن اس کی پیدائش کا دن اور تاریخ مقرر کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ انسان کی ابتدائی تاریخ نامعلوم ہے موجودہ تاریخ بنی آدم کی آبادی سے برسوں بعد کی ہیں۔ اس لئے کسی طرح یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ انساں فلاں وقت پیدا ہوا۔ ہاں یہ ضرور معلوم ہے کہ انسان یا دوسری گنہگار قوم جب پیدا ہوئی اسی وقت شیطان بھی پیدا ہوا تھا۔

شیطان کو کس نے پیدا کیا

شیطان کو اُسی برتر ہستی نے پیدا کیا جس نے تمام کائنات عالم کو بنایا۔ لیکن شیطان کے پیدا کرنے سے اس پر کوئی الزام نہیں لگتا۔ کیونکہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں شیطان صفت عارضی ہے۔ خدا نے زاہد، عابد، عالم، چور، ڈاکو، زانی، ظالم کو صرف انسان ہونے کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اور زہد، عبادت، علم، چوری، زنا، ڈکیتی، ظلم کی صفتیں بعد کو عارض ہوئیں۔

اسی طرح شیطان کو انسان یا جن ہونے کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اور صفت شیطنت اس کو بعد میں عارض ہوئی۔ جزو ذاتی کا ذمہ دار خدا ہے اور صفت عارضی کا ذمہ دار خود انسان یا جن ہے۔

شیطان کو کیوں پیدا کیا گیا

اس لئے اگر یہ سوال کیا جائے کہ شیطان کیوں پیدا کیا گیا۔ تو جواب میں یہ سوال ہوگا کہ انسان کیوں پیدا کیا گیا۔ جو انسان کے پیدا ہونے میں مصلحت ہے

وہی شیطان کے پیدا ہونے میں۔ زاہد اور چور دونوں کو خدا نے پیدا کیا انسان ہونے کی حیثیت سے دونوں ایک ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ چور کو خدا نے کیوں پیدا کیا۔ کیونکہ جو زاہد کے پیدا کرنے میں مصلحت ہے وہی چور کے پیدا کرنے میں۔ ظاہر ہے کہ جب دو چیزیں ایک حیثیت رکھتی ہونگی تو ان کی مصلحت بھی ایک ہوگی۔ خدا نے زاہد کو صرف انسان ہونے کی حیثیت سے پیدا کیا۔ زہد بعد کو عارض ہوگیا۔ اسی طرح چور کو انسان ہونے کی حیثیت سے پیدا کیا۔ چوری کی صفت بعد کو طاری ہوئی۔ لہذا انسان اور شیطان کے پیدا ہونے کی مصلحت ایک ہے۔ اچھے کام کئے انسان کہلایا۔ بُرے کام کئے شیطان کہلایا۔ تمام انسانوں کی غرض خلقت ایک ہے عام اس سے وہ اچھے فعل کریں یا اپنی غرض کے خلاف بُرے افعال میں مبتلا ہو جائیں شیطان بھی اِن میں داخل ہے۔

اس لئے تمام انسانوں کی غرض جس میں شیطان بھی داخل ہے ایک ہوگی۔
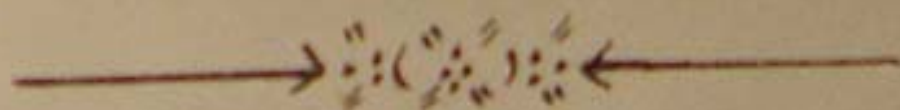
کیا شیطان خدا کی بہ نسبت زیادہ قوی ہے یا وہ بھی حکم خدا کا مطیع و فرماں بردار ہے۔ اگر شیطان خدا کی بہ نسبت قوی نہیں تو وہ سرکشی کیوں کرتا ہے

خدا کی قدرت عامہ تمام ممکنات پر حاوی ہے۔ کیونکہ مخلوق خالق سے قوی نہیں ہو سکتا ہے۔ عقل اس امر کو ناممکن جانتی ہے کہ پیدا ہونے والا پیدا کرنیوالے سے طاقت میں بڑھ جائے یا اس کے مساوی ہو۔ کیونکہ جو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ فنا کرنے پر بھی قادر ہے۔ یا یوں کہوں کہ ارباب فلسفہ کا اتفاق ہے کہ فاعل کی طاقت منفعل سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام عالم فاعل حقیقی کا منفعل ہے، اس لئے خدا کی قدرت کا تمام مخلوق پر شامل ہونا ضروری ہے شیطان بھی اسی کا مخلوق ہے لہذا وہ بھی اسی کی قدرت کے ماتحت ہے۔ شیطان اس کی قدرت کاملہ کے سامنے اسی طرح عاجز ہے جس طرح ایک عابد۔ لیکن دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی اپنے افعال ارادی میں

مختار کلیات و جزئیات ہے۔ اس لئے اسے اختیار ہے کہ اپنے خالق کے قوانین فطریہ کی پابندی کرے یا نہ کرے۔ جب انسان اس کے قوانین کی پابندی کرتا ہے مطیع کہلاتا ہے اور جب مخالفت کرتا ہے شیطان کہلاتا ہے۔ اگر کوئی غلام آقا سے قوی نہ ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کی اطاعت بھی کرے۔ خصوصاً جبکہ آقا غلام کو پورے اختیار سپرد کردے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ اس غلام کا انجام کیا ہوگا۔ نتیجہ کلفت خیز ہو یا راحت آمیز۔ تاہم غلام اپنے زمانۂ اختیار میں اطاعت اور سرکشی دونوں کے بہترین نمونہ پیش کرسکتا ہے۔ اور آقا کو مختار بنانے کے بعد مجبور کرنیکا کوئی حق بھی حاصل نہیں ہے۔ اکثر بچے ماں باپ کی بہ نسبت کمزور ہونے کے باوجود شرارت کرتے ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بچہ ماں باپ سے زیادہ قوی ہے یا قوی نہیں ہے تو اُن کے حکم سے شرارت کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شیطان خدا سے قوی ہے۔ یا قوی نہیں ہے تو اس کے حکم سے افعال بد کرتا ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیطان خدا کی قدرت کاملہ کے سامنے عاجز ہوتے ہوئے اس کا مطیع و فرمانبردار نہیں ہے شیطان اپنے اختیارات کو خواہشات کے ماتحت غلط استعمال کرکے خدا سے سرکشی کرتا ہے

درحقیقت یہ سوال کہ شیطان خدا کی بہ نسبت قوی ہے یا اس کے حکم کا مطیع ہے غلط اصول پر مبنی ہے۔ کیونکہ غلام کی کمزوری کا یہ لازم نہیں کہ وہ آقا کی خدمت بھی کرے۔

جب خدا گزشتہ اور آیندہ حالات سے واقف تھا تو اِس نے شیطان کو کیوں پیدا کیا

خداوند عالم تمام گزشتہ و آیندہ حالات کا جاننے والا ہے۔ وہ کلیات اور جزئیات کا بغیر واسطہ عالم ہے کیونکہ اس کی ذات خود مبدء انکشاف ہے لیکن اس کا علم فعل کی علت نہیں بنتا۔ اگر کوئی نجومی زید کو بتائے کہ وہ جمعرات کو مر جائے گا اور وہ مر بھی جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نجومی کی پیشین گوئی سے زید کی موت واقع ہوئی۔ کیونکہ قانون فلسفہ کے مطابق علم معلوم کے تابع ہوتا ہے نہ کہ معلوم علم کے تابع۔ اگر حکیم اپنی حذاقت اور تجربہ کاری کی بنا پر کسی سے کہے کہ تو جمعہ کے روز بیمار ہو جائیگا اور وہ بیمار بھی ہو جائے۔ تو کیا کوئی دُنیا کا عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ حکیم کی نبض شناسی نے زید کو بیمار ڈالدیا۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ علم معلوم کی تخلیق کا سبب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح خدا کا یہ علم کہ شیطان سے بُرے افعال صادر ہوں گے اس کی تخلیق یا عدم تخلیق کا

سبب نہیں بن سکتا۔ خدا نے شیطان کو انسان یا جن ہونے کی حیثیت سے
بنایا۔ صفت شیطنت اس پر بعد کو طاری ہوئی۔ اس لئے جو مصلحت انسان یا
جن کی دیگر افراد کے پیدا کرنے میں ہے وہی مصلحت ان افراد کے پیدا کرنے
میں ہے جن سے صفت شیطنت ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ قاتل و مقتول انسان
ہونے کی حیثیت سے ایک ہیں۔ ہاں صفت عارضی دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ
ہیں۔ اس لئے خدا کی جو مصلحت قاتل کی تخلیق میں ہے وہی مصلحت مقتول
کی تخلیق میں۔ مقتول کو انسان اور قاتل کو شیطان کہتے ہیں۔

دُنیا کیوں پَیدا کی گئی

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی دوسری افراد
کیوں پیدا کی گئیں۔ تاکہ شیطان کی تخلیق کی مصلحت منکشف
ہو جائے۔ اس کے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ ہر شے
بحیثیت وجود اپنے عدم سے بہتر ہے۔ کیونکہ وجود ایک روشنی ہے اور
عدم تاریکی۔ اور روشنی تاریکی سے افضل و بہتر ہے اور مبدء فیاض
سے وہی فعل صادر ہوتا ہے جو افضل و بہتر ہو۔ اس لئے تمام عالم کا وجود
مبدء فیاض سے ہُوا۔

مسئلہ تقدیر کا حل

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ علم فعل کی علت نہیں ہوتا
یہ ہی حقیقتاً مسئلہ تقدیر کا حل ہے۔ یہ اعتقاد کرنا کہ جو
کچھ اس کے علم میں ہے وہ ضرور ہو گا۔ اس لئے زید کا نوکری

کرنا بکر کا مزدوری کرنا بے کار ہے. بالکل غلط ہے. اسی غلط اعتقاد نے
مسلمانوں کو میدان ترقی سے کوسوں پیچھے ہٹا دیا. دل کا جوش، تدبیر کی قوت
ہمت کی بالیدگی عقل کی افزائش یہ تصور کرتے ہی ختم ہو جاتی ہے کہ جو کچھ ہماری
قسمت میں ہے وہ ضرور پورا ہوگا. میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں کہ علم الٰہی غلط
نہیں ہو سکتا. اگر اس کے علم میں یہ گزر چکا ہے کہ زید بھو کا مرے گا تو بیشک
ایسا ہی ہوگا. لیکن کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ مزدوری کو عیب سمجھیگا ملازمت
کو برا جانے گا. کمانے سے گھبرائے گا. نہ یہ کہ علم الٰہی اس کو بھوکا مار ڈالے گا
اگر کوئی جفار یہ حکم لگائے کہ کل رات کو زید کے گھر میں چوری ہوگی. اور
چوری بھی ہو جائے تو کیا زید کو عدالت یا پبلک کے سامنے یہ کہنے کا حق ہے
کہ جفار کے علم نے میرے گھر میں چوری کرا دی. بالفرض اگر ایسا کہے گا تو لوگ
اس کو بے وقوف بتائیں گے. کیونکہ چوری کا سبب جفار کا علم نہیں ہے بلکہ
چوروں کا آنا، مال کا موجود ہونا. پہرہ دار کی غفلت چوری اور علم جفار کا سبب
ہے. اسی طرح زید کی غفلت، مزدوری کو عیب سمجھنا. ملازمت کو برا جاننا اس
کی موت اور علم الٰہی کا سبب ہے. نہ یہ کہ علم الٰہی ان اسباب اور اس کی
موت کا سبب ہے. لہذا اچھے یا برے آثار اور نتائج کا وجود افعال اور اسباب
کی صحیح یا غلط ترتیب پر موقوف ہے. ہاں اس کا مجھے انکار نہیں ہے کہ بعض
اوقات انسان کے افعال میں غیبی تائید ہوتی ہے.

باب ۶

اہل ہنود ویدوں، عیسائی انجیل، یہودی توریت، مسلمان قرآن کو خدائی کتاب مانتے ہیں۔ اس لئے ان میں غلطی نہ ہونی چاہیئے حالانکہ ہر ایک مذہب دوسرے کی کتاب کی غلطیاں نکالتا ہے۔ ان میں غلطی کس بنا پر ہوتی ہے اور کون مذہب غلطی کرتا ہے

تقریباً دنیا کا ہر مذہب اپنے لئے کوئی نہ کوئی الہامی کتاب تجویز کرتا ہے اور اپنے خیال میں اسی کو صراط مستقیم جانتا ہے۔ پھر باہمی اختلاف کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ باہم ان کتابوں میں جن کی طرف الہام کی نسبت دی جاتی ہے متضاد احکام موجود ہیں۔ قرآن کی تعلیم وید کے خلاف ہے اور وید کی تعلیم قرآن کے برعکس۔ اسی طرح وید کی تعلیم انجیل کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اگر ان کتابوں کے تمام احکام متفق ہوتے تو دنیا کے مذاہب

میں اختلاف نہ ہوتا۔ یہی اختلاف اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ تمام کتابیں جن کو خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے الہامی نہیں ہیں۔ ورنہ ان کے احکام میں تضاد و تناقض نہ ہوتا۔ یا اس قدر تحریف ہو چکی ہے کہ اب ان کو خدائی کتابیں نہیں کہہ سکتے۔ جب تمام کتابوں کی صورت یہ ہے تو دیکھنا اس کا ہے کہ کون سی کتاب الہامی کہلانے کی مستحق ہے اور اس کا معیار کیا ہے، قرآن، انجیل، وید، دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ہیں اس لئے ان ہی پر تنقیدی نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

مذہب اور مذہبی کتابوں کا سنگ بنیاد اور اصل اصول توحید ہے اس لئے میں اسی کو معیار بنا کر تینوں کتابوں کی تعلیم کو معزز پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ تاکہ ناظرین کو صحیح فیصلہ کا موقع ملے۔ اور فاضل دہریہ پر الہامی کتاب کی حقیقت واضح ہو جائے۔

قرآن کی تعلیم اور مسئلہ توحید

توحید مذہب کی روح رواں ہے۔ اس لئے ہر ایک کتاب نے اس کو قوی دلیلوں سے واضح کرنے میں انتھک کوشش صرف کی ہے۔ لیکن کامیابی کا سہرا کس کے سر رہا۔ یہ ان مذہبی ارباب بست وکشاد کے عادلانہ فیصلہ پر موقوف ہے جو غیر جانبدارانہ تحقیق کو اپنا فریضہ جانتے ہیں۔ میں جو کچھ عرض کرتا ہوں وہ اس لئے عرض نہیں کرتا کہ میں مسلمان ہوں۔ مسلمانوں کے ماحول میں رہا ہوں۔ اسلام

کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اسلام کے گہوارہ میں لوریاں لی ہیں ماں باپ
نے یہ ہی سکھایا تھا کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ محمد اس کے رسول ہیں۔ جو مجھے
جانتا ہے وہ میری طبیعت سے بھی آگاہ ہے۔ اپنا ہو یا غیر میں کسی کی بات
بے دلیل نہیں مانتا۔ نہ اُس بات کو ظاہر کرتا ہوں جس پر قطعی دلیل نہ ہو۔ مجھے
بچپن سے اس سے نفرت رہی کہ سُنی سُنائی باتوں پر یقین کیا جائے۔ مذہبی
تحقیق تو درکنار۔ یوں روزمرہ کے معاملات میں بھی احتیاط کرتا ہوں۔

میری جو کچھ عرض ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ دلیل اور عقل مجھے مجبور
کرتی ہے کہ میں بتاؤں کہ قرآن نے تمام الہی اور غیر الہامی کتابوں میں مسئلہ توحید
کو سب سے زیادہ صاف اور واضح کیا۔ دوسری کتابوں کی طرح اس کے قدم
ہرگز اس پرخطر میدان میں نہیں ڈگمگائے۔ وہ دلیل کا علم لیکر شجاعانہ ڈھنگ سے
نکلا۔ جیسا کہ میرے حسب ذیل بیان سے معلوم ہوگا۔

لوکان فیہما الہۃ الا اللہ لفسدتا۔ ترجمہ:۔ اگر زمین و آسمان میں ایک سے
زیادہ خدا ہوتے تو نظامِ عالم بگڑ جاتا۔

کیونکہ دونوں کی طاقتوں کو بحیثیت الوہیت مساوی ماننا پڑے گا ورنہ طاقتوں
کے کم و بیش ہونے کی صورت میں صرف ایک خدا ہو سکتا ہے یعنی وہ جس کی
قدرت زائد ہو۔ دونوں کی مساوی طاقت تسلیم کرنے میں ماننا پڑے گا کہ ہر
ایک خدا دوسرے کی رضا کا محتاج ہے۔ اور نظام عالم دوسرے کی منشا کے بغیر

مرتب نہیں کر سکتا۔ ورنہ ایک خدا کسی شخص کے پیدا کرنے کا ارادہ کرے اور دوسرا اُس کے عدم کا تو وہ موجود نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نظام عالم اُسی وقت قایم رہ سکتا ہے جبکہ وہ ایک قدرت کاملہ کے ماتحت ہو۔ قرآن نے اس عقلی دلیل کو پیش کر کے یہ بتا دیا کہ صفات کمالیہ یعنی قدرت، علم، قدامت وغیرہ کا جامع صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اگر دو خدا جامع صفات کمالیہ تسلیم کئے جائیں تو ان میں کچھ نہ کچھ امتیازات ضرور رہوں گے۔ ورنہ دوئیت نہ رہے گی۔ اور جب امتیازات ہوں گے تو ہر ایک خدا صفات مشترکہ اور ممیزہ سے مرکب ہوگا اور جو مرکب ہوتا ہے وہ حادث ہوتا ہے۔ اس لئے دونوں خدا حادث ماننے پڑینگے اور یہ بھی ناقابل انکار امر ہے کہ حدوث الوہیت کو فاسد کر دیتا ہے کیونکہ حادث اپنے وجود میں دوسرے کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ جو شے پردہ عدم میں ہو۔ وہ خود بخود موجود نہیں ہو سکتی۔ جب تک دوسرا اس کو وجود میں نہ لائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ محتاج خدا نہیں ہو سکتا۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ حدوث سے الوہیت میں فساد واقع ہوتا ہے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ فسادِ الوہیت، فساد نظامِ عالم کا باعث ہے۔ کیونکہ علت کا فساد معلول کے فساد کو مستلزم ہے اگر آج آفتاب میں کوئی خرابی واقع ہو جائے تو اس کی روشنی میں بھی خرابی واقع ہو گی۔ اگر آپ آگ کو بجھا دیں تو اس کی حرارت بھی فنا ہو جائے گی۔ منطق کے قاعدہ کے مطابق اس آیت سے دو طرح نتیجہ مُرتب ہوگا۔

قیاس استثنائی اگر عالم میں ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو اُس کا نظام بگڑ جاتا۔ لیکن اس کا نظام نہیں بگڑا۔

(نتیجہ) لہذا عالم میں ایک سے زیادہ خدا نہیں ہیں۔

قیاس حملی شکل اوّل خدا کی دوئیت مفسد الوہیت ہے اور ہر مفسد الوہیت مفسد نظام عالم ہے۔

(نتیجہ) خدا کی دوئیت مفسد نظام عالم ہے۔

ویدکی تعلیم اور مسئلہ توحید وید کی تعلیم یہ ہے کہ خدا، روح، مادہ، قدیم ہیں۔ یعنی صفت کمالیہ جو اصل اصول ہے اس میں تینوں شریک ہیں۔

(ا) اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ قانون کہاں تک عقلی دلیلوں سے موید ہے اگر خدا، روح، مادہ کو قدیم تسلیم کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کو مستغنی بالذات ماننا ہوگا۔ کیونکہ قدیم وہ ہے جو اپنی ذات میں کسی کا محتاج نہ ہو۔ اور جب ان میں ہر ایک مستغنی بالذات ہے تو خدا کو کیا حق ہے کہ وہ روح کو مادہ کے ساتھ متصل ہونے پر مجبور کرے۔ اس لئے کہ ان میں کوئی کسی کا ممنون احسان نہیں ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مادہ سے ملحق ہونا روح کی خوشی پر منحصر ہے۔ تو میں کہنے کی جرأت کروں گا کہ روح کسی مادہ سے ملحق ہونے کو پسند نہ کرے گی۔ کیونکہ قید ہر شئے کو بُری معلوم ہوتی ہے اور اگر روح پسند

بھی کرے تو عالم میں فساد واقع ہوگا۔ کیونکہ ہر روح اس امر کی خواہشمند ہوگی کہ اس کا تعلق اُس جسم سے ہو جو بادشاہ کے یہاں پیدا ہوا ہے۔ لہذا غربا کے جسم ہمیشہ بے روح رہیں گے۔ جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے۔

(۲) اگر خدا، روح، مادہ کو قدامت میں شریک فرض کیا گیا تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ تینوں کے لئے امتیازات علیحدہ علیحدہ ہوں ورنہ تین نہ کہلائیں گے۔ اس لئے ان میں ہر ایک امور مشترکہ اور امور ممیزہ سے مرکب ہوگا۔ اور مرکب حادث ہوتا ہے جیساکہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ لہذا یہ تینوں حادث ہوں گے۔

(۳) مادہ کے حادث ہونے پر باب اول میں استدلال کیا جا چکا ہے۔ جس کے برخلاف آجتک کوئی دلیل قایم نہیں کی گئی۔ مجملاً منطق کی شکل اول سے پھر دہراتا ہوں۔ مادہ محل حوادث ہے اور ہر محل حوادث حادث ہے اس لئے مادہ حادث ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مادہ پر صورتیں طاری ہوتی رہتی ہیں۔ ہَوا پانی کی صورت اختیار کرتی ہے پانی ہوا کی۔ جب سمندروں میں سے بخار اُٹھکر کرہ زمہریر میں جاتا ہے تو وہاں کی سردی سے پانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اکثر آپ نے لوٹے اور گلاس کی بیرونی ہوا کو جبکہ ان میں برف رکھا ہو پانی کے قطروں کی صورت میں دیکھا ہوگا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہوا گرم ہوتی ہے۔ اور گلاس کی بیرونی سطح برف کی وجہ سے سرد ہوتی ہے۔ اس لئے ٹھنڈ پاکر ہوا پر پانی کی صورت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تھوڑی

گرمی پاکر پانی ہوا بن جاتا ہے۔ غرض عالم کون و فساد میں مادہ پر صورتیں طاری ہوتی رہتی ہیں۔ قانون فلسفہ کے مطابق مادہ کبھی صورتوں سے خالی نہیں رہا۔ اور نہ رہ سکتا ہے۔ صورتوں کا وجود اور ان کا فنا ہونا یہ بھی بتاتا ہے۔ کہ وہ حادث ہیں۔ کیونکہ ان میں تغیر ہوتا ہے۔ جو قدیم میں نہیں ہوتا۔ اس لئے صورتوں کے حادث ہونے پر تمام اہل فلسفہ کا اتفاق ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادہ قدیم ہے اور صورت حادث۔ اس لئے مادّہ کے۔ لئے ایسا وقت بھی ہوگا جب کہ صورت نہ ہو۔ حالانکہ مادہ کبھی صورت سے خالی نہیں رہا۔ اس لئے مادّہ صورت کی طرح حادث ماننا پڑے گا۔ تاکہ دونوں میں ربط رہے۔ ورنہ ہر اُن دو چیزوں کا ربط ناممکن ہے۔ جن میں ایک قدیم اور دوسرا حادث ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وید کی تعلیم عقل اور فلسفہ کے خلاف ہے۔

انجیل کی تعلیم اور مسئلۂ توحید

عیسائی انجیل کی تعلیم کے مطابق تین قدیم مانتے ہیں خدا روح القدس۔ عیسیٰ۔ ناقدانہ نظر سے دیکھنے والے کے نزدیک۔ اس پر بھی وہی اعتراض ہوتا ہے جو وید پر قرآن کی تعلیم کے مطابق انجیل الہامی کتاب ہے۔ مگر اس میں اس قدر تحریف کی گئی کہ اس کی صحیح تعلیم کا اندازہ مشکل ہے۔ انجیل کی صحیح تعلیم وہی ہونی چاہیے جو قرآن کی ہے۔ قرآن نے سوائے واجب الوجود کے کسی کو قدیم نہیں بتایا اور قیامت تک رد نہ ہونے والی دلیل اس پر قایم کی۔ لیکن آج انجیل جو تعلیم

دے رہی ہے وہ قرآن کے برخلاف ہے۔ خدا، عیسیٰ۔ روح القدس کو اگر قدیم
تسلیم کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ تینوں کو حادث مانیں۔ کیونکہ تین اس
وقت کہے جا سکتے ہیں جبکہ ان میں ذاتی امتیازات ہوں اور یہ بھی تسلیم شدہ ہے
کہ وہ قدامت میں شریک ہیں۔ اس لئے تینوں جزممیز اور جز مشترک سے مرکب
ہوں گے۔ اور ہر مرکب حادث ہوتا ہے۔ لہذا خدا، روح القدس، عیسیٰ حادث ہونگے
اس کے علاوہ عیسیٰ کے مقدس جسم کے تغیرات مثلاً کمزوری، قوت، بچپن، جوانی
وغیرہ ان کے حادث ہونے کی دلیل ہیں۔ کیونکہ حادث کا محل بھی حادث ہوتا ہے
جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ روح القدس میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک
روح ہے بعض کے نزدیک فرشتہ۔ بہرحال، روح و فرشتہ حادث ہیں۔ کیونکہ
دونوں محل تغیرات ہیں۔ اگر روح و فرشتہ محل تغیرات نہ ہوتے تو کبھی ان پر
خوشی و رنج و دیگر تبدیل ہونے والے آثار طاری نہ ہو سکتے۔ روح کے متعلق تو روزانہ
کا تجربہ ہے کہ اس پر مختلف آثار طاری ہوتے ہیں۔ فرشتہ اگرچہ نظری شے ہے
تاہم علم فلسفۂ الٰہی میں یہ ثابت ہے کہ اس پر متغیر ہونے والے آثار طاری ہوتے
ہیں۔ اس لئے روح و فرشتہ حادث ہیں۔ حالانکہ انجیل کی تعلیم اس عقلی دلیل
کے خلاف ہے۔

تینوں کتابوں کے توازن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مسئلہ توحید کو
سب سے زیادہ واضح حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس معیار پر گہری نظر ڈالکر

ہر شخص اسلام کی حقانیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی مذہب کی غلطی کا معیار اصولی غلطی ہے۔ جس کے اصول صحیح ہوں گے وہ مذہب بھی صحیح ہو گا۔ اور جس کے اصول عقل کے معیار کے مطابق نہ ہوں گے وہ مذہب بھی صحیح نہ ہو گا۔

لہٰذا صرف اہل قرآن حق پر ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ رہا یہ امر کہ ہر مذہب دوسرے مذہب پر اعتراض کیوں کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً خود غرض اور ضدی ہے اس لئے ہر شخص اپنے مذہب کے تحفظ کی خاطر دوسرے کے مذہب کو مٹانا چاہتا ہے۔ اگر آبا پرستی اور خود غرضی کا مادہ نکل جائے تو تمام انسان ایک مذہب پر ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اعتراض کرنے کے لئے صرف ہاتھ میں قلم اور منہ میں زبان کی ضرورت ہے۔ ورنہ اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو اعتراضوں کا دائرہ کم ہوتے ہوئے ایک روز بالکل ختم ہو سکتا ہے۔
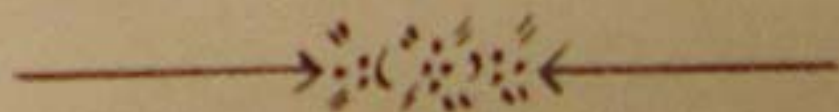
باب ۷

کیا خدا کو یہ علم نہ تھا کہ انسانی دماغ اس قابل نہیں کہ وہ شیطان کا مقابلہ کر سکے اگر نہ تھا تو اس کا علم محدود ہوا اور اگر تھا تو اس نے اتنی عقل انسان کو کیوں نہیں دی کہ وہ شیطان کا مقابلہ کرتا
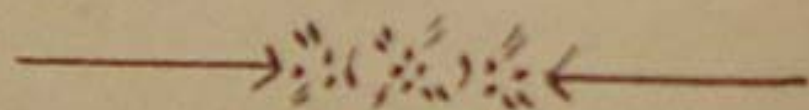
خدا کا علم نامحدود ہے۔ علم اس وقت محدود ہو سکتا ہے جب وہ کسی امر پر موقوف ہو۔ یعنی اسباب جمع ہو گئے علم ہو گیا۔ اسباب جمع نہ ہو سکے علم نہیں ہوا۔ خدا کا علم غور و فکر، مقدمات کی ترتیب، قیاسوں کے نتیجہ پر موقوف نہیں ہے۔ وہ تمام کلیات، جزئیات کو بلا واسطہ جانتا ہے۔ کیونکہ وہ خود مبدء انکشاف ہے۔ پھر اس نے قوموں کو اتنی عقل کیوں نہیں دی کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں نہ آئیں؟ یہ غلط فہمی ہے جس کی بنیاد شیطان کی حقیقت کے نہ سمجھنے پر منحصر ہے۔ شیطان افراد انسان سے علیحدہ نہیں ہے۔ جو گھروں کے اندر، کمروں کے پردوں اور لحاف

اور گدوں کے درمیان دل کی تہ میں چھپ کر بہکاتا ہے۔ بلکہ وہ منظر عام پر اپنے کو شناخت کرا کے دھوکہ دیتا ہے۔ اسے سب جانتے ہیں۔ اسے سب پہچانتے ہیں۔ فرض کیجئے زید اپنے دوست کو زنا پر اُبھارتا ہے۔ کیا اُس وقت زید شیطان نہیں ہے۔ کیا اس کا دوست اُس کو نہیں پہچانتا۔ نہیں نہیں خوب جانتا ہے خوب پہچانتا ہے۔ پھر بھی اپنا ہمدرد سمجھتا ہے۔ اگر زید کا دوست زنا کرنے پر تیار نہ ہو تو کیا کرے گا۔ بس یہی کہ خاموش ہو جائے گا۔ نہ یہ کہ اس کو مجبور کریگا۔ معلوم ہوا کہ انسان خود مختار ہے۔ شیطان اس کو ارتکاب جرائم پر مجبور نہیں کرتا۔ اچھا تو کیا زید کے دوست کی عقل اس کے بہکانے سے جاتی رہی۔ یہ بھی نہیں ہوا۔ پھر یہ کیونکر الزام قایم ہو سکتا ہے کہ خدا نے انسان کو اتنی عقل کیوں نہیں دی کہ وہ شیطان کا مقابلہ کر سکے۔ اگر شیطان کے بہکانے سے عقل مغلوب ہو جاتی تو چور چوری کو۔ ڈاکو ڈکیتی کو۔ زانی زنا کو شرابی شراب کو اچھا سمجھتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر چور سے کہا جائے کہ تیرا بیٹا بی ۔اے یا فاضل ہو جائے یہ اچھا ہے یا چور۔ تو وہ یقیناً اس کو پسند کرے گا کہ میرا بیٹا بی۔اے یا فاضل ہو جائے وہ اس کا چور ہونا کبھی پسند نہ کرے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی عقل و تمیز خواہشات کے غلبہ اور شیطان کے بہکانے سے زائل نہیں ہوتی۔ اور نہ وہ اس قدر کمزور ہے کہ شیطان کا مقابلہ نہ کر سکے۔

روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو گناہ پر ابھارتا ہے لیکن اس پر

قریبی نقشہ دیکھنے کے بعد بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اگر انسان کی عقل کمزور ہوتی اور مقابلہ کی طاقت نہ رکھتی تو ہمیشہ بہکانے والے سے مغلوب ہو جاتی۔ حالانکہ اکثر بہکانے والا فریب دیتے دیتے تھک جاتا ہے اور اس کا مصاحب بالکل متاثر نہیں ہوتا۔

قوموں کے گمراہ ہونیکا صحیح سبب

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا نے انسان کو اتنی عقل دی ہے کہ وہ شیطان کا مقابلہ کر سکے تو وہ کیوں گناہ کرتا ہے۔ اس کے متعلق یہ عرض کرنا ہے گناہ کے مختلف اسباب ہیں۔ مثلاً غضب۔ شہوت۔ ضرورت۔ خوف وغیرہ لیکن انسان کی عقل اس وقت بھی زائل نہیں ہوتی۔ وہ بُرائی بھلائی کو برابر محسوس کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے میلان طبع کو ترک نہ کرے۔ کبھی انسان عقل کے صحیح اصول فطرت کے درست آئین کو ماحول سے متاثر ہو کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس لئے گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

فرض کیجئے زید نے ایک شرابی کی گود میں پرورش پائی۔ زید اپنی طبیعت کے اعتبار سے کتنا ہی نیک سہی لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ پالنے والے کی عادت سے متاثر نہ ہو۔

اگر انصاف کی گہری نظر سے دیکھا جائے تو عقل شیطان کے مقابل میں قوی ہے۔ کیونکہ یہ کبھی نہیں دیکھا کہ عقل نے شیطان کی بات تسلیم کی ہو۔ لیکن

ہاں گنہگار جرائم پیشہ کو عموماً دیکھا گیا ہے کہ وہ عقل کے حکم کو تسلیم کرتے ہیں عام اس سے کہ وہ اس پر عمل پیرا ہوں یا نہ ہوں۔ زید کے شراب پینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عقل سلب یا مغلوب ہو گئی۔ بلکہ اس نے عقل و شعور کے باوجود خواہش نفسانی کو ترک کرنا نہ چاہا جس کی وجہ نفس پروری ہے۔ ورنہ انسان ہر گناہ کو چھوڑ سکتا ہے۔ جیسا کہ مشاہدات بتاتے ہیں کہ فلاں چور نے ہمیشہ کے لئے چوری سے توبہ کی۔ فلاں شرابی نے شراب سے توبہ کی۔ اگر عقل کمزور ہوتی تو شیطان کے غلبہ سے توبہ کرنا ناممکن ہو جاتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ میں نے مشاہدہ پیش کیا۔

باب ۸
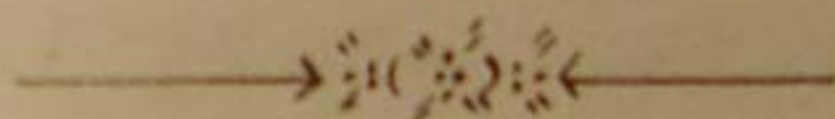
ہر انسان بھوک، پیاس کو فطرتًا محسوس کرتا ہے اسی طرح اگر کوئی مذہب فطری اور دین الٰہی ہے تو اس کو انسان فطرتًا محسوس کیوں نہیں کرتا

اس میں شک نہیں کہ انسان فطرتًا بھوک پیاس وغیرہ کو محسوس کرتا ہے کیونکہ نیچری اصول کے لئے کسی دلیل و رہبر کی ضرورت نہیں۔ ذوقِ سلیم خود حاکم ہے۔ بول و براز کی ضرورت پر کسی نے آج تک لیکچر نہیں دیا۔ بھوکے شخص کو گو وہ جاہل محض کیوں نہ ہو کبھی کسی نے نہیں جتایا۔ آخر بھوکے کو بھوک کیوں نہیں بتائی گئی؟ اس لئے کہ اس کا وجدان سلیم خود بغیر کسی کے بتائے ہوئے بھوک کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح آجتک کوئی مدرسہ نہیں کھولا گیا جس میں اس قسم کی تعلیم دی جاتی ہو۔ بچہ سمجھدار ہوتے ہی ان فطری ضرورتوں کو محسوس کرتا ہے۔ اس لئے وجدان سلیم کے علاوہ اس درس کے لئے کسی معلّم کی ضرورت نہیں۔

فاضل دہریہ کا یہ اعتراض کہ جس طرح انسان بھوک پیاس کو فطرتاً محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مذہب خصوصاً اسلام جس کو فطری ہونے کا دعویٰ ہے۔ حقیقۃً فطری ہے تو اس کو انسان کیوں نہیں محسوس کرتا۔ کھلا ہوا سفسطہ ہے۔ میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں کہ انسان فطری امور کو خود بخود محسوس کیا کرتا ہے۔ اسی کلیہ کے ماتحت بھوک، پیاس محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کیا بھوک کے ساتھ انسان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ میں گیہوں کی روٹی کھاؤں یا جو کی۔ پلاؤ کھاؤں یا زردہ۔ ہرگز نہیں۔ وہ صرف غذا کی ضرورت محسوس کرتا ہے آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہ سُنا ہوگا کہ میں گیہوں کی روٹی کا بھوکا ہوں۔ یا مجھے پلاؤ کی بھوک ہے۔ دُنیا کا ذہین ترین انسان بھی غلّہ کی تخصیص کے بغیر مطلقاً بھوک محسوس کرتا ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ گیہوں کھائے یا جَو۔ پلاؤ کھائے یا زردہ یہ اُس کے تجربہ اور عقل پر موقوف ہے۔ اگر وہ یہ جانتا ہے کہ مجھے گیہوں کی روٹی مفید ہوگی اور پلاؤ نقصان دیگا۔ تو وہ گیہوں کی روٹی کھائے گا۔ اور اگر وہ یہ جانتا ہے کہ مجھے جو کی روٹی مفید ہوگی تو وہ جَو کی روٹی کھائے گا۔ غرض غلّہ کی تخصیص تجربہ اور عقل پر موقوف ہے۔ مذاقِ سلیم صرف بھوک کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ بھوک، پیاس وغیرہ فطری ہیں۔ لیکن یہ کہ کس قسم کی غذا کھائی جائے یا کونسا پانی پیا جائے۔ یہ غیر فطری ہے اس لئے اس کا انحصار عقل و تجربہ پر ہے۔ اسی طرح ہر انسان فطرتاً مذہب کی ضرورت محسوس کرتا ہے یہی

وجہ ہے کہ عالم کون وفساد میں کوئی ایسا انسان نہیں جو کسی نہ کسی مذہب کا پابند
نہ ہو جن کو لوگ دہریہ کہتے ہیں وہ بھی درحقیقت ان خیالات اور اعتقادات کے
پابند ہیں جو ان کے نزدیک انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ اسی کا نام مذہب
ہے۔ مذہب اس راستہ کو کہتے ہیں جس پر انسان چلتا ہے۔ اس لئے دہریہ بھی
مذہب کی قیود سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ رہا یہ امر کہ انسان کون سا مذہب اختیار
کرے۔ یہ اس کی عقل سلیم اور تجربہ پر موقوف ہے۔ انسان ہمیشہ کسی خاص غذا کی
طرف توجہ کئے بغیر مطلقاً بھوک محسوس کرتا ہے۔ غذا کی خصوصیت اس کی عقل و تجربہ
کی ممنون احسان ہے۔ اسی طرح انسان ہمیشہ کسی خاص فرقہ کی طرف رغبت کئے بغیر
عموماً مذہب کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اور مذہب کی خصوصیت عقل و تجربہ پر موقوف
ہے۔ اور اگر فاضل دہریہ کو اس ہی پر اصرار ہو کہ کسی خاص مذہب کی ضرورت انسان
کیوں نہیں محسوس کرتا تو میں یہ عرض کروں گا کہ انسان فطرتاً اسلام کی ضرورت
محسوس کرتا ہے اور اسی طرف طبعاً راغب ہوتا ہے۔ زید جب تک شکم سیر ہے کھانے
کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن خلو معدہ کی تکلیف کے وقت بھوک محسوس کرتا
ہے۔ اگر پانی کی تکلیف نہ ہو تو کبھی کوئی پانی کی ضرورت محسوس نہ کرے۔ اگر دم نہ گھٹنے
لگے تو کبھی ہوا کی ضرورت محسوس ہو غرض امور نظریہ کا احساس اسی وقت ہوتا ہے
جب انسان تکلیف میں مبتلا ہو۔ اسی طرح انسان مذہب اسلام کی ضرورت محسوس
کرتا ہے مگر اسی وقت جب وہ بلاؤں میں گھر جائے۔ تکلیف پہنچتے ہی اسلام

یاد آتا ہے۔ جب انسان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹتا ہے الموں کا ہجوم ہوتا ہے
اپنے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ دوست دشمن نظر آتے ہیں۔ عالم کا ذرہ ذرہ قاتل دکھائی
دیتا ہے تو وہ عالم یاس میں باد مخالف کے طوفان خیز تھپیڑے کھاتا ہوا چاروں طرف
نگاہ دوڑاتا ہے۔ ہر طرف سے مایوسی کے بعد خود بخود اس کے دل میں ڈھارس
بندھتا ہے جس کو وہ نہیں سمجھتا کہ اس کا ہمدرد فاعل کون ہے۔ اس وقت دل
ٹوٹ ٹوٹ کے کسی غیبی امداد پر سنبھالے لیتا ہے۔ یہی مخفی طاقت اسلام
کا مرکز ہے یہیں سے اسلام شروع ہوتا ہے۔

یہ بھی قانون فطرت ہے کہ انسان مصیبتوں کے وقت جس کو اپنا
ہمدرد پاتا ہے تو اس کے لئے بہترین اور اعلیٰ ترین اوصاف بیان کرتا ہے
اور عیبوں سے اس کو بچاتا ہے۔ ان ہی اعلیٰ اوصاف اور عیوب کا نام
صفات ثبوتیہ و سلبیہ ہیں جن کو انسان ضرورت اور تکلیف کے وقت
محسوس کرتا ہے۔ یہ امر بھی ناقابل اغماض ہے کہ ہر شخص اپنے ممدوح اور محسن
سے تعلقات بڑھانا چاہتا ہے۔ اور اس کے روابط کو اپنے لئے فخر جانتا
ہے۔ اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ اس کے احکام سے سرکشی کرنا احسان فراموشی
ہے۔ اگر احسان فراموشی کی گئی تو محسن رنجیدہ ہوگا۔ اس لئے خوشگوار
تعلقات قایم رکھنے اور اس کے غضب و رضا کے قوانین معلوم کرنے کے
لئے انسان فطرتاً ایسے واسطے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ جو ان

اہم فرائض کو اعلیٰ طریقہ سے انجام دے سکے۔ اسی واسطے کا دوسرا نام نبی یا امام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان تکلیف اور مصیبت کے وقت اسلام کے اجزا ترکیبی کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔
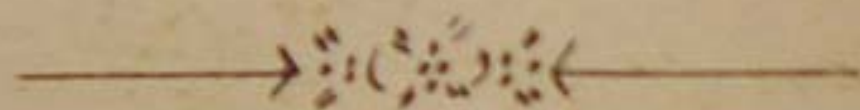
باب ۹

امتحان صرف اس کا لیا جاتا ہے جس کے حال سے امتحان لینے والا ناواقف ہو۔ کیا شیطان اور انسان کے افعال سے خدا واقف نہیں ہے۔ اگر واقف ہے تو انسان کا امتحان شیطان کے ذریعہ سے کیوں لیا جا رہا ہے۔ انسان اور شیطان کا تصادم شیر و بکری کا مقابلہ ہے اگر بکری شیر کا مقابلہ نہ کر سکے تو اِس کمزور کو کس بنا پر سزا دی جائے گی۔

⟵ ❊ ⟶

لاعلمی پر امتحان کا حصر اصولی غلطی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ممتحن اس کی حالت سے جس کا امتحان لے رہا ہے ناواقف ہو۔ امتحان کی تین مصلحتیں ہوتی ہیں
(۱) ممتحن اس شخص کی حالت سے جس کا وہ امتحان لے رہا ہے واقف ہو جائے
(۲) ممتحن واقف ہو لیکن جس کا امتحان لیا جاتا ہے اس کو جتانا اور متنبہ کرنا مقصود ہو

(۳) عامۃ الناس کو اس کی حالت سے واقف کار بنایا جائے۔

نمبر ۳ میں ممتحن کا مقصد کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنے والوں کی نظروں میں ذلیل کیا جائے۔ یا ان کی نگاہ میں عبرت کا مرقع کھینچا جائے۔ اور کبھی یہ مقصد ہوتا ہے کہ پبلک کی نظر میں اس کی وقعت ہو۔ اور جو عہدہ اس کے سپرد کیا جائے۔ عام لوگ اس کا اُسے مستحق سمجھیں۔ خدا کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ عالم نہ ہو۔ کیونکہ تمام کلیات وجزئیات اس کے سامنے بلا واسطہ حاضر ہیں۔ اس لئے اگر فرض کیا جائے کہ وہ بندوں کا امتحان لیتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) عوام الناس کا امتحان جتانے اور مشتبہ کرنے کے لئے ہو یا دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے۔

انبیار اور اوصیا کا امتحان صرف اس لئے ہوا کہ انہیں بڑے عہدہ سپرد کئے جائیں۔ اور عوام کی نظر میں وہ ان عہدوں کے مستحق ثابت ہوں۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ شیطان و انسان کا تصادم شیر و بکری کا مقابلہ ہے تو مجھے اس امر کے تسلیم کرنے میں ذرا عذر نہ ہو گا کہ انسان سے اس کے اعمال پر مواخذہ کرنا بے جا ہے۔ لیکن یہ فرض کرنا غلط ہے۔ کیونکہ زید کبھی اپنے اس دوست سے جس نے اس کو گناہ پر ابھارا تھا ایسا نہیں ڈرا جیسا بکری شیر سے۔

شیطان چڑیل، بھوت، دیو نہیں ہے جو کسی کو اپنی مہیب شکل سے ڈرائے اور ارتکاب جرائم پر مجبور کرے۔ زید اور بہکانے والا طاقت میں

مساوی ہیں۔ بلکہ اگر زید عقل سے کام لے تو اس کی طاقت زائد ہے کیونکہ عقل تمام قوتوں کی حاکم ہے۔ اور حاکم محکوم سے زبردست ہوتا ہے۔ اِس لئے عقل کی طاقت شیطان سے زائد ہوگی۔

انسان اور شیطان کے مقابلہ کو شیر و بکری سے تشبیہ دینا کھلا ہوا مغالطہ ہے۔ بکری کے لئے ناممکن ہے کہ وہ کسی وقت شیر پر غالب آئے۔ لیکن عقل اکثر اوقات شیطان پر غالب آتی ہے۔ اگر عموماً شیطان سے عقل مغلوب ہوتی تو دُنیا میں کوئی گھڑی ایسی نہ ہوتی جس میں فتنہ و فساد نہ ہوتا۔

زنا، چوری، ڈکیتی کے جرم میں بہت کم لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر ایک قصبہ میں دو ہزار آدمی ہیں تو زیادہ سے زیادہ ان میں سو آدمی جرائم پیشہ ہونگے شیطان کو غلبہ ہوتا تو قصبہ کے تمام آدمی جرائم پیشہ ہوتے۔ بلکہ یوں کہوں کہ اگر شیطان انسان کی عقل پر غالب ہوتا تو وہ تمام دُنیا کی اقوام کو ایک وقت میں باہم قتل و غارت پر مجبور کرتا۔ اس لئے عالم کا نظام درہم و برہم ہو جاتا۔ حالانکہ قتل و غارت کے واقعات آبادی کے تناسب سے بہت کم ہوتے ہیں۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ گناہ کرنے والوں کی تعداد نیکیوں سے زیادہ ہے لیکن شیطان کو ہر وہ صورت اختیار کرنی چاہئے تھی جس میں جرائم کا ارتکاب زیادہ ہو بڑے گناہ کرنے والے معدودے چند ہیں۔ اگر شیطان غالب ہوتا تو عوام الناس بالاعلان عظیم الشان گناہوں کا ارتکاب کرتے۔ ایک ہی وقت میں شیطان ہنگامہ

برپا کر دیتا۔ انبیاء اور اوصیا کے علاوہ تمام عقلا واضح طریقہ سے بڑے بڑے گناہوں میں شریک ہوتے۔ اس وقت نہ کوئی کسی کو بُرا جانتا اور نہ افعال بد سے اس کو روکنے کی نصیحت کرتا۔ اگر شیطان عقل پر غالب ہے تو ایک ہی وقت میں تمام دنیا کے آدمیوں کو زنا پر کیوں نہیں ابھارتا۔ تاکہ عالمگیر فتنہ برپا کرنے میں وہ کامیاب ہو۔ اب تک کیوں نظام ہستی قایم ہے۔ سب کا صرف ایک جواب ہے۔ کہ عقل روک تھام کرتی ہے۔ اور اسے شیطان کے بہکانے پر غلبہ حاصل ہے۔ جس طرح شیطان کسی کا ہاتھ پکڑ کر گناہ پر مجبور نہیں کرتا۔ اسی طرح عقل اس کو گناہ نہ کرنے پر مجبور نہیں کرتی۔

لیکن شیطان کی تمام چالاکیوں کی آخری وقت تک تردید کرتی ہے اگر عقل اور شیطان کے مقابلہ میں وہی تناسب ہوتا۔ جو بکری اور شیر کے تصادم میں ہے۔ تو ہر شخص جس طرح بکری کی کمزوری پر رحم کھاتا ہے اس کے برخلاف شیر کو زدوکوب کر کے اس کو چھڑاتا ہے۔ اسی طرح گناہ کرنے والے پر رحم کرتا۔ حالانکہ چور کو سزا دی جاتی ہے۔ ڈاکو قید ہوتا ہے۔ برادری سے جرائم پیشہ علیحدہ کیا جاتا ہے۔ دُنیا کی تمام عدالتیں بڑی بڑی سزائیں تجویز کرتی ہیں۔ کسی کو سولی دیجاتی ہے کسی کو پھانسی۔ کوئی کالے پانی اتارا جاتا ہے کسی سے چکی پسوائی جاتی ہے۔ کوئی غلامانہ طور سے فرش وغیرہ بناتا ہے غرض دُنیا کی گورنمنٹ گنہگار سے کیوں مواخذہ کرتی ہے۔ آج تک جج نے کبھی یہ

فیصلہ نہیں دیا کہ بے چارہ چور بے قصور ہے۔ اس کی عقل پر شیطان غالب آگیا۔ اس لئے یہ بے گناہ ہے۔ اور اگر اس قانون پر عمل ہونے لگے تو پھر جرائم کی کوئی حد نہ رہے۔ دنیا کی ہر عدالت یہ سمجھتی ہے کہ انسان کو عقل کے آرڈر کی تعمیل کرنی چاہیئے۔ اسی لئے وہ جرائم پیشہ سے ان کے افعال پر مواخذہ کرتی ہے۔ اگر خدا بھی اسی طرح انسان سے اس کے افعال بد پر مواخذہ کرے تو اس کی عین عدالت ہے۔

فاضل دہریہ کی خدمت میں دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ یہ تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان میں گناہ کی طرف رغبت دلانے والی قوت ہر وقت موجود ہے عام اس سے کہ اس کو شیطان کہا جائے یا نہ کہا جائے۔ پھر آپ نے آج تک کسی عدالت کو اس طرف کیوں نہیں توجہ دلائی کہ جرائم پیشہ لوگ قوتِ شہوانی سے مجبور ہیں۔ عقل پر نفس امارہ غالب ہے۔ یا عدالت خود کیوں متوجہ نہیں ہوتی۔ یا اگر آپ کے یہاں چور نقب لگائے تو آپ عدالت میں دعویٰ دائر نہ کریں گے؟

یہیں سے اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ انسان کی عقل شیطان کے مقابلہ میں کمزور نہیں ہے ورنہ اس پر یقیناً رحم کیا جاتا۔
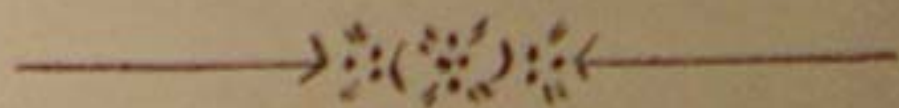
باب ۱

خدا نے اب تک شیطان کو کیوں فنا نہیں کیا۔ کیا کوئی چرواہا اس کو پسند کرے گا کہ اس کے گلّہ کو بھیڑیا ستائے کیا وہ بھیڑیے کے نیست و نابود ہونے کی کوشش نہ کریگا؟

ہر چرواہا یہ چاہتا ہے کہ اس کا گلّہ بھیڑیے کے ظلم سے محفوظ رہے اسی لئے وہ بھیڑیے کے نیست و نابود کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کرتا ہے۔ وہ ایک سیکنڈ کے لئے اس پر راضی نہیں ہو سکتا کہ بھیڑیا گلّہ کے پاس سے بھی گزرے۔ وہ اس کے تحفظ میں اپنی آخری تدبیر صرف کرتا ہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بھیڑیا علیحدہ رہے یعنی جنگلات کے وحشتناک نشیب و فراز، غیر آبادیوں کے خطرناک مناظر، تاریک باغوں کے مہیب مقامات سے گلّہ پر حملہ نہ کرے بلکہ گلّہ کی بکریاں خود ایک دوسرے کے لئے بھیڑیا بنجائیں تو اس وقت چرواہے کا کیا فرض ہوگا۔ کیا وہ اس تمام گلّہ کو جس کو اس نے بڑی محنت و مشقت سے پالا تھا۔ نیست و نابود کر دیگا؟ ہرگز نہیں۔ چرواہا

فنا کرنے کے بجائے ان میں اصلاح کی کوشش کرے گا۔ اور اپنے ذہن میں برابر ان اسباب کی فراہمی کا خاکہ لئے ہوئے ہوگا جس سے گلہ کی درستگی کا خیال ہو۔ قدرت نے ایسا ہی کیا انسان کی ہستی کے ساتھ ساتھ ہادی باطن کو جس کا دوسرا نام عقل ہے بھیجا۔ دوسری طرف ہادی ظاہر یعنی نبی کا انتظام کیا۔ نبی نے عقل کی روشنی میں فطری اور مفید دستور العمل دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور تمام ان اصول اور آئین کو سمجھایا جن سے انسان کی معاشرتی، تمدنی، مادی، روحانی اصلاح ممکن تھی۔

آج تک اصلاح کیوں نہ ہو سکی؟ صرف اس لئے کہ انبیاء کے قوانین فطریہ کو دنیا نے اس نظر سے نہیں دیکھا جس نظر سے دیکھنا چاہیے تھا۔ سب کو خاص خاص مذہبوں سے مخصوص جانکر نظر انداز کر دیا گیا۔ جناب موسیٰ کا دستور العمل کیوں برا ہے؟ وہ یہودی مذہب کے پیغمبر تھے اور ہم مسلمان ہیں۔ ابن مریم کا دستور العمل کیوں برا ہے؟ اس لئے کہ وہ عیسائیوں کے پیغمبر تھے اور ہم یہودی ہیں۔ پیغمبر آخر الزماں کا دستور العمل کیوں برا ہے اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے پیغمبر تھے اور ہم ہندو ہیں۔ اگر دنیا ان کے آئین کو سچے ریفارمر کی حیثیت سے دیکھتی تو کبھی گمراہ نہ ہوتی۔

انبیاء کی تعلیمات بلا تفریق قوم و ملت تمام عالم کے لئے برابر مفید تھیں اس لئے موسیٰ۔ و عیسیٰ و محمد مصطفےٰ وغیرہ کو کسی خاص مذہب سے مخصوص کرنا

غلطی ہے۔ وہ تمام دُنیائے انسانی کے لئے قدرت کے نمائندہ بن کر آئے تھے خصوصاً مکہ کے امی کی مقدس تعلیم جتنی مسلم پارٹی کے لئے کارآمد تھی۔ اتنی ہی غیر مسلم پارٹیوں کے لئے۔

خدا شیطان کو فنا کرسکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا

یہ امر بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ اگر خدا شیطان کو فنا کر دے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میرے خیال ناقص میں اسے عالم کا ذرہ ذرہ فنا کرنا ہوگا۔ جب تمام دُنیا نیست و نابود ہو جائے گی تب شیطان کا خاتمہ ہوگا۔

کیونکہ انسانوں میں اُن چند افراد انبیاء وغیرہ کے علاوہ جن کو معصوم مان لیا گیا ہے تمام گناہ کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو گناہ پر ابھارتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اتفاقاً گناہ نہ کرے۔ اور دوسرے کو بھی گناہ پر نہ ابھارے تو بھی وہ قابل اعتبار نہیں۔ کیونکہ بشریت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے گناہ صادر ہونا ممکن ہے۔ لہذا شیطان کے فنا کرنے کے لئے دُنیا کے تمام انسانوں کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

انسانوں کے علاوہ حیوانات میں بھی یہ ہی سلسلہ قایم ہے۔ ایک جانور دوسرے جانور کو ستاتا رہتا ہے۔ شیر بکری پر حملہ کرتا ہے۔ بلی کبوتر پر حملہ کرتی ہے۔ یہ جانور ہم جنس نہیں ہیں۔ ایک ہی جنس کو دیکھئے۔ دو بجار آپس میں لڑتے ہیں

دو بھینسے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ مرغ۔ بٹیر۔ تیتر۔ لال وغیرہ باہم متصادم ہوتے
ہیں۔ کیا یہ شیطنت نہیں ہے؟ سب سے پہلے جنگ عناصر اربعہ میں ہوتی ہے
پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ آگ پانی کو بخار بنا دیتی ہے۔ مٹی آگ کو گل کرتی ہے
آگ مٹی کو جلاتی ہے۔ غرض ایک عنصر دوسرے کو فنا کرتا ہے۔

اس لئے اگر خدا شیطان کو فنا کرنا چاہے تو اس کو عالم کا ذرہ ذرہ فنا
کرنا ہوگا۔

شیطان کے فنا نہ کئے جانے کی مصلحت یہ بھی ہے کہ دُنیا کی کوئی شے
ایسی نہیں جو ہر حیثیت سے شیطان ہو۔ ورنہ مبدء فیاض سے اس کا صادر
ہونا محال ہوگا۔

جس کو ہم شر سمجھتے ہیں وہ ایک حیثیت سے شر ہے۔ دوسری حیثیت سے
خیر فرض کیجئے۔ موسلا دھار پانی پڑ رہا ہے۔ بڑھیا کی جھونپڑی۔ فقیر کی کٹی۔
غریب کے کچے کوٹھرے کے لئے وہ یقیناً شر ہے کیونکہ وہ ان سب کو معدوم
کرے گا۔ لیکن پیاسی زراعت، تشنہ زمین، سوکھے پودوں کے لئے نعمتِ
غیر مترقبہ ہے۔ اگر اس خیال سے کہ بڑھیا کی جھونپڑی۔ فقیر کی کُٹی۔ غریب کا
کوٹھرا برباد ہو جائے گا بارش نہ ہو تو خیر کا ایک بڑا حصہ فنا ہو جائے گا۔ کیونکہ قحط
سے تمام انسان، حیوانات، نباتات مٹ جائیں گے۔ آفتاب بعض اوقات پھلوں
کو جلا دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انسان، حیوانات، نباتات کی زندگی اِس

پر موقوف ہے۔ چنانچہ بعض اوہام پسند طبیعتیں اس کو دیوتا مانتی ہیں۔ اب اگر
آفتاب کو ان میووں کے لحاظ سے جن کو اس نے جلایا ہے فنا کیا جائے تو دنیا
کا کوئی ذی روح باقی نہ رہے گا۔ ہوا جس کی تیزی بعض اوقات بڑے بڑے
پیڑوں کو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہے یا اس کی حدت پودوں کو جلا دیتی ہے اگر بالکل
بند کر دی جائے تو انسان، حیوانات، نباتات کی کوئی فرد باقی نہ بچے۔ ہوا ان
پیڑوں کے لحاظ سے جن کو اس نے جڑ سے اکھاڑا ہے یا ان پودوں کے اعتبار
سے جن کو اس نے جلایا ہے۔ شر ہے۔ لیکن ذی روحوں کے واسطے خیر ہے۔ اسی
طرح دنیا کی ہر ایک شے کے دو پہلو ہیں۔ خیر اور شر۔ اس لئے اگر اس کو شر کے
اعتبار سے مٹا دیا جائے تو خیر بھی ختم ہو جائیگا۔ اسی طرح ہر شے باعتبار وجود
خدا کی نعمت ہے اور باعتبار افعال بد شیطان ہے۔ اس کے علاوہ اگر شیطان
نہ ہوتا تو خیر کا احساس مشکل تھا۔ تعرف الاشیاء باضدادھا۔ ترجمہ:۔ چیزیں
اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اور اگر خیر کا احساس نہ ہوتا تو انسان ترقی کے
اس زینہ پر نہ پہنچ سکتا جس پر وہ آج ہے۔ کیونکہ قوت احساس ہی قانون ارتقا
کا پہلا باب ہے۔

شیطان کیونکر پیدا ہوتا ہے

انسان خود امور اختیاریہ میں خیر کو شر بنا لیتا ہے۔ خدا
نے زمین میں لوہا۔ لوہے میں چھری بننے کی صلاحیت عطا
کی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان لوہے کی چھری

بنا کر ترکاریاں کاٹے۔ میوے تراشے۔ قلم بنائے۔ لیکن وہ ایک بے گناہ کو
ذبح کر دیتا ہے۔ جو چیز خدا نے خیر بنا کر بھیجی اُس کو انسان نے اپنے اختیار سے
شیطان بنا لیا۔ کلورا فارم اِس لئے ہے کہ مریض کو بے ہوش کر کے ازالۂ
مرض کے لئے اس کا آپریشن کیا جائے۔ تاکہ وہ ناقابل برداشت عمل جرّاحی
سے جس کا تصور اس کے رگ وریشہ میں لرزا پیدا کرتا ہے مرعوب نہ ہو۔ لیکن
زید اس کو اپنے دشمن پر آزماتا ہے تاکہ اس کے قتل کی سازش مخفی رہے۔ یا
اس کے گھر میں چوری کرے۔ اب وہ ہی کلورا فارم جو خیر تھا شر بن گیا۔ اِس
سے معلوم ہوا کہ خیر غلط استعمال سے شر بن جاتا ہے۔ قدرت نے انسان کو
آنکھیں عطا کی ہیں تاکہ وہ دیکھ بھال کر چلے، دوست و دشمن کو پہچانے نشیب و
فراز میں ٹھوکر کھانے سے بچے۔ زہر و تریاق میں فرق کرے۔ اگر وہ چوری
کے لئے دوسرے کے مال پر نظر ڈالے۔ زنا کے لئے اجنبی عورتوں کو دیکھے۔
قتل کے لئے دشمن کو پہچانے تو وہی آنکھ جو خیر بن کر آئی تھی شر بنجائیگی۔
قدرت نے انسان کو ہاتھ دے ہیں تاکہ خیرات تقسیم کرے، اندھوں کا ہاتھ
پکڑے ضعیفوں کی امداد میں حصّہ لے۔ لیکن اس کے بجائے اگر وہ کسی مظلوم
کے مارنے پر ہاتھ اُٹھائے تو وہی ہاتھ جو خیر بن کر آئے تھے شر بن جائیں گے
اسی طرح زبان اس لئے ہے کہ اقوال حسنہ اور مکارم اخلاق کی تعلیم دے۔ لیکن اگر
کوئی شخص گالیاں دینے لگے، جھوٹ بولنے لگے تو وہی زبان شر، یا

شیطان بن جائے گی۔

انسان خود بھی شیطان کو فنا کر سکتا ہے

خدا پر کیا الزام۔ انسان اگر چاہے تو خود شیطان کو فنا کر سکتا ہے کیونکہ شیطان یا شر کا وجود خیر کے غلط استعمال سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ اگر وہ خیر کو غلط استعمال نہ کرے تو یہ ناممکن ہے کہ شیطان کا وجود ہو۔ بلکہ میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر انسان قوانین فطرت اور اسلام کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرے گو شیطان کے فنا کرنے کا قصد بھی نہ ہو پھر بھی وہ نیست و نابود ہو جائیگا۔ کیونکہ قتل، زنا، چوری، کا ظہور اسی وقت ہوتا ہے جبکہ جادۂ اعتدال سے ہٹ کر نفس پرستی کے دائرہ میں قدم رکھا جائے۔ ظاہر ہے کہ خانقاہ کی چہار دیواری میں مصلّے عبادت بچھانے والا۔ اہل و عیال کی جائز خدمت بجالانیوالا صحیح کسب معیشت کا طالب۔ مواسات قومی کا حامی ان افعال کی طرف متوجہ نہیں ہوتا جس سے شر جس کا دوسرا نام شیطان ہے پیدا ہو۔ اس لئے شیطان کے فنا کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ انسان اس مذہب کے آئین پر گامزن رہے جس کو فطری اور الٰہی دین کہا جاتا ہے۔
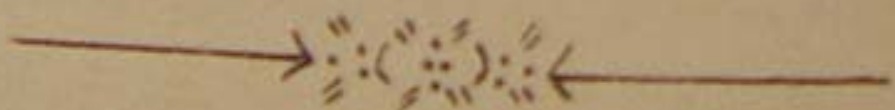
باب ۱۱

سب سے پُرانا مذہب کون ہے اور کس بنا پر اس کو پُرانا کہا جاتا ہے۔ کیا یہ مذہب دُنیا کے ہر خطہ پر رائج تھا اور جب خُدا نے سب انسانوں کے لئے ایک سچّا مذہب بنایا ہے تو اتنے مذہب کیونکر ہو گئے۔ کیا خدا کے مقابل میں کوئی دوسری طاقت ہے جس نے اِس کی مرضی کے خلاف اتنے مذہب رائج کر دے

دُنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اپنے مذہب کو قدیم نہ بتاتا ہو۔ ہندو عیسائی یہودی، اہل اسلام وغیرہ اپنے مذہب کو قدیم اور دوسرے مذہبوں کو جدید جانتے ہیں۔ شاید ہی کسی مذہب کی کوئی فرد ہو جو اس مرکز اعلیٰ سے قرب کی خواہش پر خاموش رہے۔ اور صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ ارباب بست وکشاد

اپنے مقصد پر دلائل کا انبار بھی لگاتے ہیں۔ میرے خیال ناقص میں کسی
مذہب کے قدیم وجدید ہونے کی بحث بے کار ہے جب تک قدامت و
جدت کا معیار مقرر نہ کیا جائے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ پہلے انسان کا مذہب الہامی ہوگا کیونکہ اس وقت
نہ تجربہ فرض کیا جا سکتا ہے اور نہ تعلیم۔ اگر کسی دوسرے انسان کو معلّم فرض کیا
گیا تو وہی پہلا انسان ہوگا اور یہ دوسرا حالانکہ اس کو پہلا انسان فرض کیا گیا
ہے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ پہلے انسان نے اپنے مذہب کی بنیاد تجربہ
پر رکھی۔ کیونکہ تجربہ اس وقت ہوتا ہے جب مجملاً کسی شے کا علم پہلے سے ہو۔
اگر وہ آدمی جس نے کبھی دوسرے آدمیوں کی صورت نہ دیکھی ہو۔ ماں باپ سے
ناآشنا ہو۔ کھانے پینے سے لابلد ہو جنگل میں چھوڑ دیا جائے جہاں طرح طرح کے
پھل قسم قسم کے کھانے اور ترکاریاں ہوں۔ تو کبھی ان چیزوں کی طرف اقدام
نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان کا ذہن بغیر واسطہ مجہول کی طرف متوجہ نہیں ہوتا پہلے
انسان کو یہ کیونکر معلوم ہو سکتا ہے کہ میوہ اور کھانوں سے بھوک مر جاتی ہے
پانی پینے سے پیاس بجھ جاتی ہے۔ اس کے سوائے کوئی صورت نہیں کہ قدرت
نے اس کو الہام کیا ہو۔ اس لئے پہلے انسان کا مذہب الہامی ہوگا۔ الہام ہی
کا دوسرا نام نبوّت ہے۔ لہذا پہلے انسان کو نبی ہونا چاہئے۔ یہ بھی فطرت ہے
کہ انسان اپنی ابتدا اور انتہا کو سوچتا ہے۔ اس لئے توحید و قیامت کا تسلیم

کرنا بھی طبعاً ضروری ہے۔ امامت نبوّت کی شاخ ہے اور دونوں کی ضرورت ایک ہے اس لئے میں صرف نبی کی ضرورت پر بحث کرنا چاہتا ہوں اسی طرح یہاں عدالت کا بھی ذکر حذف کرتا ہوں۔ اوّل تو چاہتا ہوں کہ کتاب مطول نہ ہو اس کے علاوہ قیامت عدالت کا نتیجہ ہے اس لئے قیامت ہی کی بحث پر کفایت کرتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انسان کا مذہب فطری طور سے توحید نبوّت اور قیامت وغیرہ کا اقرار ہوگا۔ اس معیار کے بعد بآسانی یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جو مذہب کشادہ پیشانی سے ان امور کو اپنے پہلو میں جگہ دے گا وہی دین الٰہی اور فطری ہوگا۔ اور وہی قدیم کہلانے کا مستحق ہوگا۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کے یہ وہ اصول ہیں جن کو دوسرا مذہب اتنی روشنی اور صفائی کیساتھ پیش کرنے کے لئے تیار نہیں۔ توحید کے متعلق باب اوّل میں انجیل، وید، اور قرآن کا مقابلہ دکھا چکا ہوں۔ نبوّت کے متعلق وید خاموش ہیں۔ انجیل نے نبوت کو تسلیم کیا۔ مگر اس میں حسب ضرورت خلط مبحث کر دیا۔ اس نے نبوّت کو توحید سے اس قدر ملایا کہ عیسیٰ کو قدامت میں خُدا کے شریک کر دیا۔ لیکن اسلام نے وہ غیر متزلزل دلیلیں نبوت پر پیش کیں جن کو عالم ہمیشہ تسلیم کرتا رہیگا۔

اِسلام اور نبی کی ضرورت۔ علم کبی کی غلطیاں بطلیموس اور فیثاغورس کا اختلاف

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ انسان

نظر تا ابتدا اور انتہا کی تلاش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام کائنات عالم کی
حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تحقیق معمولی مسئلہ کے
حل ہونے پر اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ دُنیا کی پوری سلطنت ملنے کے باوجود
اتنا خوش نہ ہوتے۔ جب یہ طے شدہ ہے کہ انسان مبدء، معاذ اور کائناتِ
عالم کی ماہیت سے واقف ہونے کی خواہش کرتا ہے تو اب یہ سوال ہے کہ وہ
کس طرح صحیح طریقہ سے ان کی حقیقت کا عالم ہو۔ کسی چیز سے واقفیت کیلئے علم کسبی
یا علم وہبی کا ہونا ضروری ہے۔ ان دونوں صورتوں کے علاوہ اشیاء کی حقیقت کا
علم ناممکن ہے۔ علم کسبی میں برابر غلطیاں ہوتی رہیں جیسا کہ ہم رات دن مشاہدہ کرتے
ہیں۔ اس لئے حقیقی واقفیت کا ذریعہ صرف علم وہبی ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ علم کسبی علم وہبی کی بہ نسبت آسان اور بہت آسان ہے لیکن اس آسانی
سے کیا فائدہ جس میں آئے دن غلطیوں کا ظہور ہو۔ ایک زمانہ وہ تھا۔ جب
یونان میں بطلیموس کا فلسفہ تمام دُنیا کے لئے رہبر کامل مان لیا گیا تھا۔ نہ تنہا
اس کے فلسفہ پر یونان ایمان لایا تھا بلکہ عالم کا گوشہ گوشہ اس کو تسلیم کرتا تھا بطلیموس
فیلسوف کی رائے نے اہل تحقیق کو برسوں چکر دئے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ آسمان
نو ہیں۔ ستارے آسمانوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ آسمان کی گردش سے سیارے
گھومتے ہیں۔ آفتاب زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ اور زمین بالکل ساکن ہے
آسمان انسان کی طرح نفس شاعرہ رکھتا ہے۔ اس لئے اس کی حرکت دوری

اڑادی ہے۔ رفتہ رفتہ تحقیق کا ورق اُلٹا۔ فیثا غورس فیلسوف کا زمانہ آیا۔ اس نے کایا پلٹ کر دی جس سے انسانی دماغ کی فضا میں جما ہوا نظام درہم دبرہم ہو گیا۔ اس کے خیال میں یہ سب واہمہ تھا۔ اس لئے یہ نظریہ قایم کیا۔ آفتاب ساکن ہے زمین آفتاب کے چاروں طرف گھومتی ہے۔ زمین کی دو حرکتیں ہیں۔ اپنے محور پر اور گرد آفتاب۔ اس خیال کو دوچار جھٹکے لگے لیکن موجودہ سائنسدانوں نے اس کی تائید کی۔ اس لئے دور حاضرہ میں نظام بطلیموسی کا خاکہ مٹ کر فیثا غورس کا نظریہ مقبول خاص وعام ہو گیا۔ اب نہ وہ آسمان رہا۔ نہ وہ اس کی گردشیں۔ نہ ستاروں کا جڑاؤ۔ نہ آفتاب کی حرکت۔ نہ خرق والتیام آسمان کی مشکلات۔ اس کے بجائے اب یہ خیال ہے کہ ستارے زمین کی طرح فضا میں باہمی جذب وکشش سے تھمے ہوئے ہیں۔ جس طرح نظامِ بطلیموس غلط ثابت ہو کر نظام فیثا غورس قایم ہوا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ نظام فیثا غورس بھی باطل ہو کر دوسرا نظریہ قایم ہو جائے۔ کیونکہ ہر زمانہ میں جو عقیدہ مروج ہوتا ہے۔ اُس کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ کبھی باطل نہ ہوگا۔ مگر کچھ مدت گزرنے پر اس عقیدے کے برخلاف دلیلیں مل جاتی ہیں اور نئے اعتقاد کی بُنیاد پڑتی ہے۔

رکت کیلئے پوری اوقات حرکت میں
رک کا ہونا ضروری ہے یا صرف ابتدائے
رکت کیوقت۔ اہل سائنس اور فلاسفرانِ
ونان کا معرکۃ الآرا اختلاف۔ نبوّت کی
فطری ضرورت

قدیمی فلاسفر اس امر کے
قائل تھے کہ حرکت کے
لئے آخر تک محرک کا وجود
ضروری ہے اگر کسی وجہ
سے اثنائے حرکت میں
محرک فنا ہو جائے تو حرکت
بھی ختم ہو جائے گی۔ جسم میں
حرکت اُسی وقت تک
ہے گی جب تک اس کا محرک باقی ہے۔
ان کے نزدیک حرکت اور محرک لازم و ملزوم تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے آسمان
ی حرکت کے لئے نفس شاعرہ کو محرک مانا ہے۔ اگر نفس شاعرہ کا وجود نہ ہو تو آسمان
ی حرکت بند ہو جائے۔ ماہرین فلسفہ برابر قدما کے اقوال اور اپنی تائید کے ساتھ
ان کی مضبوط دلیلوں کو نقل کرتے رہے۔ لیکن پوری طرح اس کا انکشاف نہ
ر سکے کہ ان کو آسمان کی حرکت کے لئے کیوں نفس شاعرہ تسلیم کرنیکی ضرورت
ہوئی۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ قدما کا دائرۂ نظر اس امر پر محدود ہے کہ آسمان حرکت
طبعی وقسری نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کی حرکت ارادی ہے۔ جس کے لئے
نفس شاعرہ کا ہونا ضروری ہے۔ مجھے شیخ الرئیس ابو علی سینا اور دیگر مایۂ ناز

ہستیوں پر تعجب ہے کہ انہوں نے اس بارے میں کیوں مسامحہ کیا۔

اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو مجھے یہ عرض کرنیکا حق ہے کہ قدماے یونان کا اصلی نقطۂ نظر یہی تھا کہ آسمان کی حرکت کے لئے پورے اوقات میں محرک کی ضرورت ہے۔ یہ عقیدہ برسوں اہل فلسفہ کے وسیع دماغوں میں گھومتا رہا۔ ایک یونانی فلسفی نے اس عقیدہ کو اس قدر ترقی دی کہ آفتاب کے لئے ایک محرک علیحدہ مان لیا۔ اس نے پہلے یہ رائے قایم کی کہ آفتاب ایک آگ کا گولہ ہے۔ جس کو رات بھر ایک دیوتا مشرق میں بناتا ہے اور صبح کو مغرب کی طرف پھینک دیتا ہے دوسری شب میں پھر نیا گولہ بناتا ہے اور اسی طرح صبح کو مغرب کی طرف پھینک دیتا ہے پھر خود ہی سوچا کہ دیوتا کو اس میں بڑی دقت ہوگی کہ روزانہ نیا آگ کا گولا بنائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوتا صبح کو اس آگ کے گولہ کو مغرب کی طرف پھینکتا ہے اور شام کو مغرب میں جاکر لپک لیتا ہے۔ مدت دراز کے بعد جب تحقیق نے کروٹ بدلی۔ تو معلوم ہوا کہ یہ غلط تھا۔ بلکہ حرکت کے لئے ابتدا میں محرک کا ہونا ضروری ہے۔ جدید نظریہ کی بنا پر ابتدا میں کسی طرح زمین کو حرکت ہوگئی۔ اب اس کو محرک کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اہل سائنس کے نزدیک جو شے ساکن ہے وہ ہمیشہ ساکن رہے گی جب تک کہ اس کے سکون کا برطرف کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اسی طرح جو شے متحرک ہے وہ متحرک رہیگی جب تک کہ اس کی حرکت کا زائل کرنے والا نہ ہو۔ اس پر مشاہدہ یہ ہے کہ آپ دو گیندوں کو زمین پر حرکت دیجئے۔ ایک کی جگہ صاف

چکنی اور دوسری کی جگہ کھُردری ہو۔ پہلی گیند زیادہ دیر تک حرکت کرتی رہے گی کیونکہ اس کی حرکت کا مانع کمزور ہے اور دوسری گیند جلد حرکت ختم کردیگی کیونکہ اس کی حرکت کا مانع قوی ہے۔ مانع کی کمزوری اور قوت سے گیند کی حرکتوں کا تفاوت یہ بتاتا ہے کہ جہاں مانع بالکل نہ ہوگا وہاں حرکت برابر قایم رہے گی۔ اس لئے زمین کی حرکت کے لئے ابتداءً محرک کا ہونا کافی ہے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر یہ عقیدہ بھی پہلے عقیدہ کی طرح باطل ہوجائے۔ یہ کسے خیال تھا کہ پہلا مستحکم عقیدہ جو یونانی فلاسفروں کا مایۂ ناز تھا غلط ہوجائیگا۔ لیکن آج وہ عقیدہ بے وقعت ہے۔ اسی طرح کیا تعجب ہے جب سائنس پورے شباب پر آئے تو یہ عقیدہ بھی باطل ہوجائے۔

میں نے دو نظریوں کی ردّوبدل اس لئے کی ہے کہ پبلک اس امر کا اندازہ کرلے کہ علم کسبی سے کسی شے کی حقیقت اور ماہیت یقینی اور صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکتی کیونکہ اس میں برابر غلطیاں ہوتی رہتی ہیں اس لئے مبدء و معاد اور اسباب تمدن کی حقیقت پر مطلع ہونے کا واحد ذریعہ علم وہبی ہے۔ جس میں غلطی کا امکان نہیں کیونکہ وہ خدا کے اُن عطیوں میں سے ہے جن میں انسان کی ترتیب و تنظیم کو دخل نہیں ہوتا۔ علم وہبی کا دوسرا نام نبوت ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات عالم کی حقیقت کا صحیح علم پھیلانے کے لئے فطرتاً انبیاء کو پیدا ہونا چاہیے۔

اسلام اور قیامت، تناسخ کا ابطال

یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ خالق واحد نے اپنی مصلحت سے عالم بنایا اور

اس کو اصول و قوانین نظریہ عطا کیے۔ یہ بھی ماننا ہوگا کہ اس کا کوئی نتیجہ ضرور ہے
دُنیا کے عقلا نے دو طرح نتیجہ نکالا ہے (۱) تناسخ (۲) قیامت۔ ان ہی دو لفظوں
کے لپیٹ میں عالم کا سربستہ راز ہے۔ ہزاروں برس تحقیق کرتے گزرے لیکن
یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ ان دونوں اصول میں کون صحیح ہے۔ اسلام نے تناسخ
کے بطلان پر رد نہ ہونے والی دلیلیں قایم کیں جن کا اپنے مقام سے ہٹنا
اتنا ہی دشوار ہے جتنا آسمان کا انڈے میں سمانا حقیقت یہ ہے کہ قانون
تناسخ کی بنا پر جزا و سزا کا معیار قایم نہیں رہتا۔

(۱) تناسخ کی بنا پر اس کا علم ہونا کہ سزا فلاں شخص کو دی جا رہی ہے ناممکن
ہے۔ فرض کیجئے زید اندھا پیدا ہوا۔ یہ سزا کس کو دی گئی؟ زید کو۔ اِس نے
کیا خطا کی تھی؟ آپ فرمائیں گے کہ زید نے اس سے پہلے جون میں گناہ کیا تھا۔
تو سوال یہ ہے کہ زید کو سزا کیوں ملی؟ اگر یہ کہا جائے کہ روح عمر کی ہے اس
لئے درحقیقت سزا اسی کو ملی۔ تو میرے نزدیک یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جو تمام
ارباب تناسخ کو گھیرے ہوئے ہے۔ کیونکہ روح کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ
یہ عمر کی ہے یا زید کی۔ جب کہ یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ ہزاروں بلکہ کروڑوں
جسموں سے متعلق تھی۔ ایک روح جس کا تعلق ہزاروں جسموں سے رہ چکا ہے
اس کی اہل نہیں ہے کہ اس کو زید یا عمر کی طرف منسوب کیا جائے۔ زید جب
اندھا پیدا ہوا۔ تو نہ تنہا عمر کو سزا ملی۔ بلکہ تمام ان مرنے والوں کو سزا دی گئی

جن سے روح کا تعلق رہ چکا ہے۔

(۲) ارباب تناسخ میں کوئی ایسا نہیں کہ اگر اس کو ثابت ہو جائے کہ اس نے پہلی جون میں قرضہ لیا تھا۔ تو وہ ادا کر دے۔ یا گورنمنٹ کی عدالت میں بحیثیت مدعی یا مدعا علیہ آئے۔ فرض کیجئے عدالت میں زید پر پہلی جون کے قرضہ کا کسی نے دعویٰ کیا۔ لیکن مدعی اپنے گواہ پیش نہ کر سکا یا گواہ پیش کئے لیکن جرح میں ٹوٹ گئے۔ حلف کی نوبت آئی اور آخری بنا مدعا علیہ کے حلف پر ٹھیری وہ کیونکر اس امر میں حلف اُٹھا سکتا ہے کہ میں نے پہلی جون میں قرضہ نہیں لیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مدعی روزانہ جھوٹے دعوے مدعا علیہ کے برخلاف کرے۔ کیونکہ مدعا علیہ پہلے جون کے متعلق صفائی پیش نہیں کر سکتا۔ رہا یہ کہ بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے اور شبہ سے فائدہ ملزم کو پہنچتا ہے تو جو شخص دعویٰ کرے گا وہ پورا ثبوت بھی بہم پہنچائے گا۔ تناسخ کی صورت میں مدعا علیہ کی صفائی کمزور رہے گی۔ کیونکہ مقدم مدعی کا ثبوت ہے۔

(۳) ارباب تناسخ کا اسباب معیشت اور ذرائع ارتقا میں کوشش کرنا بیکار ہے۔ زید بی۔ اے پاس کرے یا جاہل رہے اس کو آخر وہی ملے گا جو اس کے لئے پہلے جون کا عوض ہونا چاہیے۔ اہل تناسخ کو چاہیے کہ وہ ملازمتوں اور تجارتوں کو چھوڑ کر صبر و استقلال سے گھر بیٹھیں اور انتظار کریں کہ پہلے جون کی جزا اِنکو قدرتاً کیا ملتی ہے۔ صاحبان تناسخ کا روزی اور ترقی مراتب وغیرہ میں لگاتار کوشش کرنا

اور خاموش نہ ہونا بلکہ دیگر اقوام کی بہ نسبت ارتقاء کے مدارج کی فکر میں زیادہ مبتلا ہونا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ تناسخ کا اعتقاد واہمہ ہے۔ صرف باپ دادا سے سُنکر تقلیداً معتقد ہیں۔

(۴) اگر کوئی شخص اہل تناسخ پر ظلم کرے تو ان کو عدالت یا پبلک کے سامنے دعویٰ دائر نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ جتنی تکلیفیں بھی ان کو پہنچیں وہ سب پہلے جون کا عوض ہیں۔ اس بنا پر نہ کوئی ظالم ہے نہ مظلوم اگر تناسخ کو صحیح مان لیا جائے تو عدالت کا دروازہ بالکل بند ہو جائے۔ کیونکہ زید نے اگر عمر کو قتل کیا تو عمر پہلے جون کے افعال بد کی وجہ سے اس سزا کا مستحق تھا۔ اس لئے اس کے ورثاء کو زید کے خلاف دعویٰ دائر کرنے کا حق نہیں ہے۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ تناسخ صحیح ماننے پر نظام عالم بدل جائیگا۔ فرض کیجئے ایک بدمعاش جرائم پیشہ کسی متقی زاہد عابد کو ستائے۔ اہل تناسخ کو اس غریب کی ہمدردی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ عابد نے جو کچھ پہلے کیا اس کا عوض مل گیا۔ اس لئے دُنیا میں برابر جرائم بڑھتے جائیں گے جس کا آخری نتیجہ فساد ہوگا۔

(۵) ہر مذہب اپنے رہنماؤں کی قدر کرتا ہے۔ ان کی تکلیف سے بےچین ہوتا ہے۔ ان کی خوشی سے مسرور ہوتا ہے۔ اگر دوسرے مذہب کا کوئی شخص اس کو بُرا کہدے تو تمام قوم رنجیدہ ہوتی ہے یہ ایک فطری اور نیچری قانون ہے جس کے خلاف کبھی کانوں نے کوئی روایت نہیں سُنی۔ کیا میں ارباب تناسخ

ی دست بستہ دریافت کر سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص آپ کے رہنما کو برا بھلا
ے یا ستائے تو آپ رنجیدہ نہ ہوں گے؟ آئے دن کے واقعات بتاتے ہیں کہ
باب تناسخ اپنے رہنما کی ذرہ برابر ہتک گوارا نہیں کرتے۔ آخر کیوں گوارا نہیں
تے؟ جبکہ وہ پہلے جون کے افعال کی سزا پا رہے ہیں۔ تناسخ کے عقیدہ کی
ا پر دنیا سے بالکل ہمدردی اٹھ جائے گی جس پر نظام عالم کی مستحکم بنیاد ہے کیونکہ
ہنمایان قوم یا دیگر افراد کے متعلق جو تکلیفوں میں مبتلا ہیں۔ اور بے سبب ستائے
جاتے ہیں یہی حسن ظن ہوگا کہ یہ حقیقی گنہگار ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ ہمدردی
رنا گناہ ہے۔ اور اگر ہمدردی کی بھی گئی تو بے کار ہے۔ جب مدت گناہ ختم ہوگی
ب اس کو رہائی ملے گی۔ مدت گناہ سے قبل نجات ناممکن ہے۔ تناسخ کے ابطال
ے بعد اب صرف دوسری صورت رہ جاتی ہے اسی کا نام قیامت ہے۔

قیامت میں ہر شخص کی حیثیت اور پوزیشن صاف ہوگا تناسخ کی طرح ایک
شخص دوسرے کے گناہ کے عوض مبتلائے عذاب نہ ہوگا۔ جس نے جو گناہ کیا ہے
س کو غیر مجمل الفاظ میں بتا دیا جائے گا۔

تاکہ وہ اپنی غلطی کا اقرار کرے۔ جس کی روح ہوگی اسی کا جسم۔ اس لئے اسی
شخص پر عذاب کیا جائے گا جس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ قرآن صاف الفاظ
میں اپنا نظریہ سزا وجزا دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ
ترجمہ: کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائیگا۔ قیامت اور تناسخ میں یہ بہت بڑا فرق ہے کہ

تناسخ میں ملزم کی شخصیت صاف نہیں ہوتی. اور قیامت میں ملزم کی شخصیت صاف ہوگی. کیونکہ وہی روح ہوگی وہی اجزار اصلی. اور سب کے پیش نظر اپنے اپنے گناہ ہوں گے.

مبدء، معاد، نبوت وغیرہ کے مجملاً تذکرہ کے بعد میں پھر اپنے سلسلۂ کلام پر آتا ہوں. جو مذہب ان قوانین فطریہ کو اپنے ساتھ لائیگا وہ ہی قدیم ہوگا. لیکن قدیم کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ دُنیا کے ہر خطہ میں رائج ہو. کیونکہ دنیا کی محفل یک لخت لبریز نہیں ہوئی بلکہ رفتہ رفتہ اس کی آبادی بڑھی. اس لئے قدیم مذہب کو بھی رفتہ رفتہ پھیلنا چاہئے. اب اگر کوئی اس کی تدریجی ترقی میں سنگ راہ بن گیا تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی رفتار پر باقی رہے یا تو بالکل فنا ہو جائے گا. یا مانع کی قوت وضعف کے لحاظ سے تمام عالم میں مقبول ہونے کیلئے مدت درکار ہوگی

ہاں یہ سوال ہے کہ خدائی مرضی کے خلاف اتنے مذہب کیونکر ہو گئے اور اور وہ کونسی طاقت ہے جس نے خدا کی رضا کے خلاف ایسا کیا.

یہ تو ظاہر ہے کہ خدا کی قوت سب کے ما فوق ہے. خاک نشین فقیر اور زریں تاج وتخت کا مالک اس کی درگاہ میں عاجز ہیں. کیونکہ خالق مخلوق سے قوی ہوتا ہے. اس لئے یہ ناممکن ہے کہ مخلوق خالق سے طاقت میں بڑھجائے واقعہ یہ ہے کہ ازدیاد مذاہب کا تعلق کسی قوت مخالفہ سے نہیں ہے تاکہ اس کا تقابل خدا سے کیا جائے.

درحقیقت کثرت مذاہب کا سبب انسان کی خودغرضی ہے۔ بنی آدم نے اپنی اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کے مطابق مذہبوں کی ایجاد کی جو انسانیت کے مفہوم اور اس کی ترکیب حقیقی سے واقف ہے وہ اس کو بھی جانتا ہے کہ انسان کا اطلاق جن افراد و اجسام پر ہوتا ہے وہ مقاصد شخصی کے لحاظ سے مختلف الخیال ہیں۔ کیونکہ ہر شخص بالطبع خودغرض ہے عام اس سے کہ غرض جائز ہو یا ناجائز۔ اس لئے وہ افراد جن میں اتحاد خیال کا علاقہ تھا۔ اپنی خودغرضی کی بناپر حقیقی قانون اور فطری مذہب سے علیحدہ ہوکر اپنی اجتماعی زندگی کے تحفظ کے لئے نئے مذہبوں کے بانی ہوئے۔ خدا ان طاقتوں کو جو اس کی مرضی کے خلاف مصنوعی مذہبوں کی ایجاد کا باعث ہیں مجبور کرسکتا تھا لیکن اس نے اپنی مخلوق کو مختار بناکر بھیجا ہے۔ اور کسی مختار سے اختیارات سلب کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اختیار دینے والا اختیار کی سپردگی کے وقت آنے والی بے قاعدگیوں سے ناواقف تھا۔ اس لئے اس کی ذات کے لئے یہ نامناسب ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے دئے ہوئے اختیار واپس لے۔

خدا نے انسان کو مختار اور خودغرض کیوں بنایا

خدا کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ انسان کو مختار اور خودغرض نہ بناتا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ مجبور اور مختار۔ خودغرض اور غیر خودغرض میں کون بہتر ہے

کیونکہ خدا بہتر فعل کرتا ہے۔ میرے خیال ناقص میں آپ مجبور و مختار کے تقابل میں کبھی مجبور کو مختار پر ترجیح نہ دیں گے۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ وہ ہر صورت میں اختیارات کو پسند کرتا ہے۔ فرض کیجیے ایک شخص نے انجن بنایا۔ جو ہزار گاڑیوں کو کھینچتا ہے۔ منوں کا بار سکنڈوں میں میلوں پہنچاتا ہے۔ کروڑوں انسانوں کی باربرداری کرتا ہے۔ لیکن ڈرائیور کے ہاتھ کی کٹ پتلی ہے۔ خود نہ حس و حرکت رکھتا ہے نہ نشست و برخاست کر سکتا ہے۔ جس طرف ڈرائیور منہ پھیر دے چلنے لگتا ہے۔ اس کے مقابل میں اگر دوسرا انجن تیار کیا جائے جو اپنے ارادہ سے چلے۔ خود اسٹیشن پر رکے۔ اس کو آدمیوں کی تکلیف و راحت کا احساس ہو اور ڈرائیور کا محتاج نہ ہو۔ تو آپ کس انجن کو پسند کریں گے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ آپ خود مختار انجن کو پسند کریں گے۔

یہ بھی طے ہے کہ مجبور اور خود مختار انجنوں کی ذات تک ہی تعریفوں کا خاتمہ نہ ہوگا بلکہ خود مختار انجن بنانے والا دنیا والوں کے نزدیک غیر محدود مدح کا مستحق ہوگا۔ کیونکہ بنانے والے کا کمال مختار مصنوع کی صنعت میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اگر خدا مختار مخلوق نہ بناتا تو وہ ایک بہتر فعل کو ترک کرتا اور اپنے کمال کے اتم مظہر کو نہ بنا کر قوت کمالیہ کو چھپاتا جو اس کی شان کے نامناسب ہے۔

اگر خدا مجبور مخلوق کو بناتا تو اس کی قوت کمالیہ کا نقص ہوتا۔ انسان کو خود غرض بنانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ترقی کا دارومدار خود غرضی پر مبنی ہے۔ اگر انسان

غرض نہ ہوتا تو ارتقار کی اعلیٰ منزل کبھی طے نہ کرسکتا۔ خودغرضی حقیقتاً ارتقار
علت ہے۔

فرض کیجئے زید اگر خودغرض نہیں ہے تو اس کو کیا ضرورت ہے کہ ملازمت
صیبت برداشت کرے۔ کیوں انجن بنائے۔ کیوں ہوائی جہاز اُڑائے۔ اس
نا سے دُنیا کی اعلیٰ اور ادنیٰ ترقی کا باب بند ہوجائے گا، خودغرضی ہی وہ ہے
انسان کو خدمت، ملازمت، ایجاد، تجارت پر جو ارتقائے عالم کے اصول ہیں
جاری رہتی ہے۔ اگر خودغرضی مٹ جائے تو نظام عالم درہم برہم ہوجائے۔
کیونکہ زید کا دستوں سے میل جول اجنبیوں سے ملاقات صرف اس بنار
ہے کہ شاید آیندہ زمانہ میں میری ضرورت کا اُن سے تعلق ہو۔ اگر زید یہ سمجھے
فلاں شخص سے کبھی میری ضرورت کا واسطہ نہ ہوگا تو وہ ہرگز اس کے سامنے
تسلیم خم نہ کرے گا۔ عالم کا نظام ارتباط اور اتحاد پر منحصر ہے اور ارتباط و اتحاد
دغرضی پر اس لئے قدرت نے انسان کو خودغرض بنایا ہے۔

اگر خودغرضی نہ ہوتی تو نہ کوئی حاکم تھا نہ محکوم، نہ کوئی افسر تھا نہ ماتحت، نہ
وئی بزرگ تھا نہ خورد۔ اس لئے کہ کسی سے کسی کا تعلق ہی نہ ہوتا۔

پھر وہ خودغرضی جس کو بُرا کہا جاتا ہے کیا ہے۔ میرے خیال ناقص میں دو
تیں ہیں۔ (۱) وہ خودغرضی جس کے پورا کرنے کے بعد محسن کا شکریہ ادا نہ کیا جائے
(۲) وہ خودغرضی جس سے دوسرے کا مطلب فنا ہو۔ اگر محسن کا شکریہ ادا کیا جائے

اور دوسرے کا مطلب فنا نہ ہو تو خودغرضی عین حکمت ہے۔ ڈاکٹر مل نے ایک خاص مقالہ فلسفۂ خودغرضی پر لکھا ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع خودغرض ہے۔ اس کے تمام جذبات اس کے تابع ہیں۔

ممکن ہے کہ کسی شخص کو یہ شبہ ہو "اگر انسان بالطبع خودغرض ہے تو قومی رہنماؤں کے عظیم الشان ایثار اور انبیا و قائدین عالم کی بے نظیر قربانیاں بے غرض نہ ہونے کی وجہ سے قابل وقعت نہیں ہوسکتیں" غالباً یہ شبہ اُن ہی حضرات کو ہوسکتا ہے جن کا دائرہ نظر فلسفۂ خودغرضی میں تنگ ہے۔ فقرا کی امداد غربا کی اعانت عبادت تقویٰ۔ برادری سے مواسات وغیرہ بھی خودغرضی کے ماتحت ہیں۔ کیونکہ نیک کام کرنے کے بعد فطرتاً انسان کے نفس کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ خودغرضی خلوصیت کے متضاد نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص خلوصیت سے خدا کی عبادت کر رہا ہے اور اس کے نفس کو خوشی بھی حاصل ہو رہی ہے تو اس صورت میں دونوں جمع ہوں گی۔ بلکہ خلوصیت کا اطلاق اسی وقت ہوتا ہے جبکہ عابد کے نفس میں انبساط کی لہر دوڑ رہی ہو۔ اگر ایک طرف وہ عبادت میں مشغول دوسری طرف نفس کی خوشی اس کی محرک نہیں ہے اس لئے وہ رنجیدہ ہے تو اس کی عبادت پُرخلوص کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔

اگر خودغرضی قبیح ہوتی تو قدرت کبھی اس کو اپنی امانت کا ہ یعنی انسان میں ودیعت نہ کرتی۔ خودغرضی کے اس قدر بدنام ہونے کی وجہ یہ ہے۔ انسان اس کو

دوسرے آلات کی طرح غلط استعمال کرتا ہے۔ تلوار اس لئے بنائی جاتی ہے کہ اس سے تحفظ حقوق کیا جائے۔ اگر کوئی شخص کسی بے گناہ کو اس سے قتل کر دے تو تلوار قابل مذمت نہیں ہے بلکہ اس کا غلط استعمال کرنیوالا قابل مذمت ہے۔ اسی طرح خود غرضی جو حدود فطری کے اندر ہے عیبوں کا مرکز نہیں ہے بلکہ وہ شخص عیبوں کا مرکز ہے جو اس نادر قوت کو بے محل استعمال کرے دوسرے الفاظ میں یوں کہوں کہ خود غرضی نفس پرستی کا نام نہیں ہے۔ خود غرضی اور نفس پرستی میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا خلوصیت اور نفس پرستی میں۔ میں اس کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ عام لوگ جس کو خود غرضی کہتے ہیں وہ نفس پرستی کے مرادف ہے لیکن وہ حقیقی خود غرضی کی ایک ناقص فرد ہے۔

غرض انسان نے جب طبعی خود غرضی سے آگے بڑھ کر نفس پرستی کے دائرہ میں قدم رکھا۔ اور اس قوت کو جس سے ارتقاء تمدن کی اُمید تھی۔ بے محل استعمال کر کے خود غرض یعنی نفس پرست کہلایا۔ تو مذہب کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنے مقصد اور منشا کے خلاف جب مذہب کو پایا تو اس میں تبدیلیاں کیں۔ کہیں نفس کی شہرت کا دار مدار مذہب کی ایجاد پر تھا۔ اس لئے اس نے نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔

میری رائے میں زیادہ تر مذہبوں کی کثرت کا سبب تین چیزیں ہیں۔

(۱) شہرت (۲) ضرورت (۳) تقلید

یہ تینوں قریبی یا بعیدی رشتہ سے اُس خود غرضی کے ماتحت ہیں جو نفس پرستی

کے مرادف ہے۔

شہرت اور مذہب کی ایجاد

ہندوستان کے طول و عرض میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے جلال الدین اکبر کا نام نہ سُنا ہو۔ اور اس کے اخلاق و سیاسیات کی داستانیں نہ پڑھی ہوں۔ اکبر ہوشیار، سیاسی، با اخلاق اور بلا تفریق ملت ہر ایک کا ہمدرد تھا۔ جب اس کا آفتاب اقبال ہند کے اطراف میں چمکا۔ تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ یا حاشیہ نشینوں نے سمجھایا کہ اس کو مذہبی رہبر بننا چاہیئے۔ تاکہ موجودہ شہرت میں غیر محدود ترقی ہو۔ اور لوگوں کے دلوں میں انتہائی وقار قایم ہو جائے۔ اس لئے اس نے دین الٰہی ایجاد کیا۔ اس پر دوسری سلطنتوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ خود اس کے اعزا بھی ناراض ہو گئے جن میں گلبدن بیگم کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ دین الٰہی کی ایجاد کا سبب سوائے شہرت کے کچھ نہ تھا۔ اسی طرح دُنیا میں اپنی شہرت میں اضافہ کرنے کے لئے لوگوں نے بہت سے مذہب ایجاد کئے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ اس غلط ایجاد کا اثر اقوام عالم پر ہوا یا نہیں یا ان مذہبوں کی عمریں طویل ہوئیں یا کم۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر شہرت نہ ہوتی تو بعض بلکہ اکثر مذہب صحن عالم میں نہ آتے۔ دور حاضرہ میں بھی چند اصحاب مذہب کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ میں نے ۳۵ء میں دہلی کے نئے مہدی سے ملاقات کی یہ خاصے کھاتے پیتے بزرگ ہیں۔ بعض صنعتوں میں انہیں مہارت تامہ حاصل ہے

شہرت کی خاطر مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اپنا کلمہ اور کتاب بھی علیحدہ تجویز کی ہے۔ ممکن ہے کہ دو تین ضرور تمندان پر ایمان بھی لے آئے ہوں۔ جیسا کہ سُنا جاتا ہے۔ ملازمت کا آج کل قحط ہے۔ امامت تو در کنار اگر کوئی خدائی کا دعویٰ بھی کرے اور لوگوں کو روپیہ دیکر اپنا بندہ بنانا چاہے تو بھی دُنیا اور خصوصاً ہندوستان کے مفلسوں کا حصّہ ضرور لبیک کہے گا۔ سچ ہے مرتا کیا نہیں کرتا۔ حال ہی میں پنجاب میں ایک فقیر نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے۔ کچھ لوگ اس کے بندے بھی مقرر ہو گئے ہیں۔ جب انسان ضرورت میں خدائی تسلیم کرنے کو تیار ہے تو امامت و نبوّت کا اقرار کرنا کیا دشوار ہے۔ نئے مہدی نے جب اپنا اشتہار جاری کیا تو میں نے سمجھا کہ اتنے عظیم الشّان دعویٰ کا کہنے والا قابل ضرور ہو گا مگر ملاقات سے معلوم ہوا کہ شہرت و نفس پرستی کے علاوہ وہاں کوئی پونجی نہیں ہے۔ ملاقات کے وقت میرے چند شاگرد میرے ساتھ تھے میں ان کے کمرہ میں پہنچا۔ تقریباً صبح کے نو بجے تھے۔ سرما کی سرد ہوا کے جھونکے تھے اور مخاطب کو گرم کپڑوں کے باوجود لرزا رہے تھے۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی دیکھا کہ ایک خضر صورت گرم انگیٹھی سامنے رکھے ہوئے فرش پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہیں۔ میں نے اُن سے سوال کیا۔ آپ کون ہیں۔ فرمایا کہ میں نبی اور آخری مہدی ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ نبی ہیں تو کوئی معجزہ دکھایئے یا ایسی دلیل پیش کیجیئے کہ جس سے سُننے والوں کو اطمینان ہو جائے۔ سامنے

آگ کی بھری ہوئی انگیٹھی رکھی ہے اس کو جناب ابراہیمؑ کی طرح گلزار بنادیجئے
یا جناب داؤد کی طرح اس کے لوہے کو موم بنادیجئے۔ یا اس کو حکم دیجئے کہ یہ آپ
کی تصدیق کرے۔ جواب دیا کہ میرے پاس کوئی معجزہ نہیں ہے۔ محمد مصطفےٰ کو کوئی
معجزہ عطا کیا گیا تھا۔ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے کہ لے نبی ہم نے تم کو اس لئے
معجزہ نہیں دیا کہ موسیٰ و عیسیٰ کو لوگوں نے جھٹلایا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ذرا
آپ وہ آیت پڑھیں جس کا یہ ترجمہ ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ تقریباً دس
منٹ کے بعد جب میں نے سمجھا کہ ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ تو سوال کیا
کہ معجزہ کے علاوہ کوئی دلیل پیش کیجئے۔ فرمایا کہ میری نبوت کی سب سے بڑی
دلیل یہ ہے۔ کہ میں جو بات پیش کرتا ہوں اس پر وہ دلیل قایم کرتا ہوں جس کو
عام آدمی قایم نہیں کر سکتے۔ میں نے دریافت کیا کہ قیامت پر کیا دلیل ہے۔ جواب
دیا کہ آفتاب رات کو ڈوب جاتا ہے۔ صبح کو پھر نکل آتا ہے۔ اسی طرح قیامت میں
مردے زندہ ہوں گے۔ میں نے عرض کیا اوّل تو یہ غلط ہے کہ آفتاب ڈوبتا ہے
کیونکہ وہ ہر وقت نکلا رہتا ہے۔ زمین کے جس حصّہ کے سامنے اس کی شعاعیں
ہوں گی وہاں دن ہوگا۔ اور جس حصّہ کے سامنے شعاعیں نہ ہوں گی۔ وہاں
رات ہوگی۔ کوئی وقت ایسا نہیں جس میں یہ کہا جائے کہ آفتاب چھپ گیا۔ اور اگر
یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آفتاب چھپ جاتا ہے اور پھر نکل آتا ہے تو یہ ایک مثال
ہوگی نہ کہ دلیل۔ اور مثال بھی غلط۔ کیونکہ آفتاب کے چھپنے کے لئے اس کے

اجزائے ترکیبی کا انتشار ضروری نہیں۔ اور موت کے لئے یہ ضروری ہے کہ مرنے والے کے جسم کے اجزائے ترکیبی منتشر ہو جائیں۔ اور اس کی صورت شخصیہ و صورت جسمیہ فنا ہو جائے۔ کیونکہ ان دونوں کی محافظ اور اجتماع اجزا کا سبب روح ہے۔ جس کے قطع تعلق کا نام موت ہے۔ اس تقریر کو سُنکر نئے مہدی کے حواس خمسہ پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ کہتے کچھ تھے نکلتا کچھ تھا۔ ان کا تردّد اور خاموشی ان کی لاعلمی کا ثبوت دے رہی تھی۔ ان کی گھبراہٹ کو میں نے ہی نہیں بلکہ میرے شاگردوں نے بھی محسوس کیا۔

میرے ایک عنایت فرما کا بیان ہے کہ نئے مہدی نے آپ کے آنے کے بعد مجھ سے اس امر کا اقرار کیا کہ میں ان کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ میں نئے مہدی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی کمزوری کا احساس کیا۔ نئے مہدی کی ملاقات نے میرے ذہن میں یہ جما دیا کہ اکثر مذہبوں کی ابتدا نفس پرستی کے ماتحت جس کا شہرت لازمی نتیجہ ہے ہوئی۔

ضرورت اور مذہب کی ایجاد

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یہ وہ تجربہ شدہ مقولہ ہے جس سے کسی براعظم کا رہنے والا انکار نہیں کر سکتا رفتہ رفتہ جس قدر ضرورتیں بڑھیں انسان مال اور جان کے تحفّظ کے لئے قانون بناتا رہا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بنی نوع انسان خیالات کے اعتبار سے مختلف طبقات کے رہنے والے ہیں۔ اس لئے جیسی ضرورت ہوئی

اسی کے مطابق مذہب ایجاد کیا گیا۔ ضرورت کے لحاظ سے جو قانون بنایا گیا۔ وہ کسی بڑی ہستی کی طرف منسوب ہونیکا محتاج تھا۔ تاکہ اس کی حیات ابدی میں خلل نہ آئے۔ اس لئے اس امر کی بھی ضرورت تھی کہ جو قانون تحفظ کیلئے بنایا جائے اس کو مذہبی رنگ میں اچھی طرح رنگ دیا جائے۔ تاکہ مذہب کے نام پر جان دینے والے اپنے راسخ عقیدوں کیساتھ اس کا دامن تھام لیں۔ اس لئے انسان نے اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے جو قانون بنایا۔ اس کو خدائی دستور العمل کی صورت میں پیش کیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ مذہب بڑھ گئے

تقلید اور ازدیاد مذاہب

جہاں انسان ہر معاملہ میں تحقیق کو پسند کرتا ہے۔ بعض اوقات دماغ سوزی کی کلفتوں اور دیدہ ریزی کی الجھنوں سے بچ کر اپنے ابائی آئین کو قبل اس کے کہ اس پر کوئی دلیل قائم کی جائے رہبر بناتا ہے۔ ایک طرف تحقیق کی زحمت دوسری طرف آبا و اجداد کی محبت اس لئے آخری چارہ کار تقلید ہے۔ تقلید سے ایک مذہب کے مختلف مذہب ہوگئے۔ کیونکہ ابتدا میں ایک دستور العمل تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس دستور العمل کا دائرہ حسب ضرورت وسیع ہوگا۔ ابتدائی ضروریات بھی آئندہ زمانہ کی بہ نسبت کم کم ہونگی۔ اس لئے یہ ناقابل انکار امر ہے کہ پہلے مذہب میں اختصار کے ساتھ اس زمانہ کی خصوصیات کا لحاظ ضرور ہوگا۔ رفتہ رفتہ حسب زمانہ میں تبدیلی ہوئی انسان کی افراد بڑھیں' ان کے تمدن کا عروج شروع ہوا تو قدرتی اسی دستور العمل کو

جو امتداد زمانہ سے مردہ ہو چکا تھا۔ حسب ضرورت جزی تغیرات کیساتھ دوبارہ بھیجا لیکن اصول و کلیات وہ ہی قایم رہے۔ آبائی دستور العمل کے دلدادہ ان جزی تغیرات کو دیکھ کر جن کے وہ عادی نہ تھے اس سے متنفر ہو گئے اور پرانے دستور العمل پر جو ان کی نگاہ میں دنیوی و دینی نقطہ نظر سے مکمل آئین نجات اور قانون ترقی تھا عمل پیرا رہے۔ اس لئے ایک مذہب کے دو ہو گئے۔ کیونکہ بعض نے اپنے آبائی مذہب اور بعض نے اس نئے مذہب کو جو حقیقتاً نیا دستور العمل نہ تھا اختیار کیا۔ یہودی اور عیسائی اس تقلید میں دیگر اقوام کی بہ نسبت پیش پیش رہے اسی طرح زمانہ اور صدیوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مذہبوں کی کثرت ہوتی گئی۔
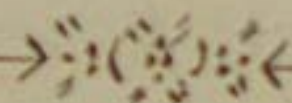
باب ۱۲

جب ہر مذہب میں چوری، ڈکیتی، زنا، جھوٹ وغیرہ ناجائز ہیں تو یہ کیونکر کہا جاتا ہے کہ فلاں مذہب ہی نجات دیگا اور بہشت تک پہنچائیگا

چوری، ڈکیتی، زنا وغیرہ کا ممنوع ہونا معیار نجات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ وہ ہیں جن کے متعلق اگر مذہب خاموش ہو جاتا۔ تب بھی انسان اپنے نوعی تحفظ کے لئے ان کی ممانعت کا قانون بناتا۔ بغیر اس قانون کے معاشرت اور تمدن نوعی ناممکن تھا۔ اسی لئے فاضل وکیل کسی مذہب کے معتقد نہ ہوتے ہوئے بھی ان افعال کو بُرا جانتے ہیں۔ درحقیقت معیار نجات وہ اصول کلیہ فطریہ ہیں جو سب سے پہلے انسان کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئے۔ جن کا ذکر ہم گزشتہ باب میں کر چکے ہیں جس مذہب نے ان اصول کلیہ فطریہ کو صاف پوزیشن میں پیش کیا وہی منجی ہو سکتا ہے۔ میں گزشتہ باب میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام سے زیادہ کسی مذہب نے ان اصول کلیہ یعنی توحید و نبوت

وغیرہ کو جو حقیقتاً مدار نجات ہیں صاف حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ اس لئے اسی
کو منجی بننے کا حق حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جس مذہب نے دُنیا میں انسان کو
گناہ سے نجات دلائی۔ وہی آخرت میں بھی نجات دلا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر
میں شراب کو پیش کرتا ہوں جس کے روکنے میں دُنیا کے اکثر مذہبوں اور سیاسی
لیڈروں نے انتھک کوششیں کیں مگر بے سود۔ اسلام نے اپنی روحانی طاقت سے
دُنیا کے ہر طبقہ پر جو اثر ڈالا اُس کا ادنیٰ اندازہ ایک ہندو بزرگ کی تقریر
سے ہو سکتا ہے۔

پیغمبر اسلام کا اصلی معجزہ

اقتباس تقریر جناب مسٹر بی' ایس' کشالپہ۔ بی' اے' ڈی' ای (لندن) ترجمہ انگریزی

آپ کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل
یہ ہے کہ آپ کی زبان میں اثر تھا
اگرچہ آپ نہایت جہالت کے زمانہ اور ایک وحشی ملک میں پیدا ہوئے۔
ماں باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا۔ آپ نہ دولتمند تھے نہ استاد ول
سے پڑھے تھے۔ غرضکہ آپ کے لئے ایک بھی وجہ ایسی نہ تھی کہ جس کی بنا پر
آپ عرب کے وحشی باشندوں کی نظر میں ایک زبردست ہستی سمجھے جا سکتے
ایسی حالت میں آپ کی نصیحت کا کارگر ہونا آپ کے اثر سے دوست' دشمن
صغیر و کبیر کی فطرت کا بدل جانا۔ ہزارہا لوگوں کا اپنی عادتی اور نفسانی خواہشوں کا

خیر باد کہدیا، اور ایک قلیل مدت میں آپ کی تعلیم کا مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک سیلاب کی طرح بہجانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر اس حالت میں جبکہ نہ اخبار تھے اور نہ مطبع تھے اور نہ ریل نہ تار برقی موجود تھی۔ میں مثالاً امریکہ جیسے تہذیب یافتہ ملک کو لیتا ہوں۔ وہاں صرف ایک شراب نوشی کو بند کرنے کے لئے کیا کیا ذرائع ایجاد نہیں کئے گئے؟ وہاں کی گورنمنٹ نے کئی سال تک جبری قوانین کے ذریعہ زبردست کوشش کی مگر سب کچھ بے فائدہ ثابت ہُوا۔ ہندوستان میں مسٹر گاندھی نے کتنی تدابیر اختیار کیں اور کر رہے ہیں ان کی امداد کے لئے ہزاروں قابل اور دولتمند آدمی موجود ہیں ان کے ساتھ بے حساب مطبع اور اخبارات بھی مصروف عمل ہیں۔ مگر شراب خواری جیسی تھی ویسی ہی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف حضرت محمدؐ کی تلقین کو دیکھئے۔ آپ کے صرف زبانی حکم سے عرب میں شراب خواری تو کیا اور کتنے ہی افعال بد قلیل مدت میں بالکل نیست و نابود ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ بے شک محمدؐ ایک سچے پیغمبر تھے۔"

اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مُسلم اور غیر مسلم اقوام اس امر پر متفق ہیں کہ اسلام نے اشرف المخلوقات کو دُنیا میں گناہوں سے بچا دیا۔ اس امر میں بھی تاریخ خاموش نہیں رہ سکتی کہ لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کی رسم عرب و ہندوستان میں عام طور سے جاری تھی۔ بیگناہ لڑکیوں کا زندہ دفن کرنا ماں باپ کی غربت یا ننگ و عار کی وجہ سے تھا۔ اس ناپاک رسم کی بدولت لاکھوں بیگناہ اور بے زبان

لڑکیوں کا خون ناحق جلّاد والدین کی گردنوں پر ہوا۔ اسلام نے انسان کو اس کی مقدس حقیقت اور اشرفیت کو بتایا جس سے وہ ناواقف تھا۔ اور یہ اچھی طرح واضح کر دیا کہ انسان کا خون بہانا ناقابل اغماض گناہ ہے۔ اور پھر انسان بھی وہ جو بےقصور و بےگناہ ہو۔ فیصلہ کے دن خاص طور سے ان لوگوں کا جائزہ لیا جائے گا جنہوں نے اپنی معصوم بچیوں کو زندہ درگور کیا۔ اسلام کے یہ حکم دیتے ہی لا تقتلوا اولادکم (اپنی اولاد کو قتل نہ کرو) عرب نے اس ناپاک رسم سے توبہ کی۔ آج کہیں مسلمانوں میں اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ برخلاف اہل ہنود کے اِن کے یہاں آج بھی ہندوستان میں یہ رسم پائی جاتی ہے۔ ایک دفعہ مجھ سے خود ایک ہندو جاٹ عورت نے بیان کیا کہ ہمارے یہاں تمباکو دیکر لڑکیوں کو مار دیتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کے علاوہ دوسرے مذہب اس قبیح رسم کو اچھا جانتے ہیں یا اس کو کم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن ہاں یہ عرض کرنے کی ضرور جرأت کرتا ہوں کہ اسلام اب سے تیرہ سو برس پیشتر انسان کو اس گناہ سے نجات دلوا چکا۔ جس میں ہندوستان کے دوسرے مذہب آج تک کامیاب نہیں ہوئے۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ جس مذہب نے دُنیا میں گناہ سے نجات دلوائی وہی آخرت میں نجات دلا سکتا ہے۔ یوں تو ہر مذہب نے منجی ہونے کا دعوی کیا ہے لیکن دعوی اسی وقت مقبول ہو سکتا ہے جبکہ مناسب طریق کار بھی ساتھ ہو۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب نے جو اپنے رہبروں کی صورتیں پیش کی ہیں اُن سے ہرگز اس

امر کا اطمینان نہیں ہوتا کہ وہ مسیح بننے کے اہل ہیں۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو منجی بتاتے ہیں مگر اس کے ساتھ توحید و تثلیث میں اس قدر غلط مبحث کرتے ہیں کہ غیر جانبدار انسان صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے نزدیک، خدا، روح القدس، عیسیٰ قدیم ہیں اس سے خدا اور عیسیٰ کی شخصیت صاف نہیں ہوتی۔ یہودی عزیر کو منجی جانتے ہیں لیکن نصاریٰ کی طرح ان کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ بدھ مذہب والے گوتم بدھ کے علاوہ کسی بزرگ ہستی کو تسلیم نہیں کرتے، جو کچھ تھے گوتم بدھ تھے۔ یہاں تک کہ خدا بھی کوئی چیز نہیں۔ ہندو سری کرشن جی کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن سری کرشن جی کا حسب ذیل دعویٰ جو ارجن سے کورو پانڈوں کی لڑائی میں کیا تھا۔ ان کی پوزیشن کو بڑھانے کی بجائے گھٹاتا ہے۔ "بے وقوف اور جاہل لوگ مجھے انسان ہی سمجھتے ہیں۔ وہ میری قدرتوں سے ناواقف ہیں۔ ان کو یہ شناخت نہیں کہ تمام مخلوقات اور کائنات کا ایشور میں ہی ہوں۔" (بھگوت گیتا)

مذاہب عالم کے مقابلہ میں اسلام کی تبلیغ

ان تمام مذاہب کے مقابلہ میں اسلام نے اپنے رہبر کو جس سادگی سے پیش کیا وہ اس مقولہ سے ظاہر ہے۔ انما انا بشر مثلکم الا ان یوحی الی۔

ترجمہ۔ میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ فرق یہ ہے کہ خدائے واحد میری طرف وحی نازل کرتا ہے۔" نہ یہ کہا کہ میں خدا ہوں یا خدا کا بیٹا ہوں یا کائنات عالم کا خالق ہوں، رشی اور درویش میں نے ہی پیدا کئے ہیں۔ جیسا کہ سری کرشن جی کا دعویٰ تھا

بلکہ یہ بتایا کہ میں سیدھا سادھا ایک انسان ہوں ہاں مجھ پر وحی ضرور نازل ہوتی ہے۔ دوسرے مذاہب نے اپنے رہبروں کو پبلک پلیٹ فارم پر پیش کرتے وقت اس قدر مبالغہ سے کام لیا کہ اجنبی طالب ہدایت عقل کے خلاف غلو آمیز اصول نہ سمجھنے سے متحیر ہو گیا۔ اور صحیح رائے قایم نہ کر سکا۔ لیکن اسلام نے نہ کبھی رسول کو خدا کا بیٹا بتایا نہ خالق کائنات بیان کیا۔ نہ خدا کو اس کی وجہ سے معطل ٹھیرایا۔ ایک طرف توحید کا پوزیشن صاف کیا کہ وہ واحد ہے۔ قدامت اور علم وغیرہ میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ روح اور مادہ، انبیاء و اوصیاء، آسمان و زمین، سب اس کے پیدا کردہ ہیں۔ دوسری طرف رہبر کامل کی حیثیت واضح کی "ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ ترجمہ:۔ محمد بحیثیت ایک رسول کے ہیں۔ ایسے پہلے بھی رسول گزرے ہیں۔ اسلام کا اپنے پیغمبر کے متعلق وہ اجنبی دعوی نہیں جو دیگر مذاہب نے عیسیٰ، گوتم بدھ، سری کرشن جی کے متعلق کیا ہے۔ مجھے اس امر کا یقین نہیں آتا کہ ان رہنمایان ملت نے اپنے متعلق عقل کے خلاف ایسے دعوی کئے ہوں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ معتقدین نے اصل پر حاشئے چڑھا کر اپنے رہبروں کی صحیح صورت ہیبتناک لباس میں پیش کی ہو۔ کیونکہ جوش اعتقاد میں اکثر ایسی غلطی ہوتی ہے اسلام اور اس کے معتقدین نے جوش میں بھی ایسے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ کسی متعصب مسلمان کی زبان سے بھی یہ نہ سنا ہو گا کہ محمدؐ خدا کے بیٹے ہیں یا سری کرشن جی کی طرح کائنات عالم کے خالق ہیں یا گوتم بدھ کی طرح دنیا کی انتہا ان ہی پر ہوتی ہے

معتقدین کیا کیا مبالغہ نہیں کرتے۔ ہر مذہب نے اپنے رہبر کے متعلق خلاف عقل مبالغوں کو صرف کیا ہے۔ لیکن یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ پیغمبر اسلام کے حلقہ بگوش شان الوہیت اور حیثیت محمدی کے خلاف کوئی لفظ مونہہ سے نہیں نکالتے۔ ہر مسلمان عام اس سے کہ جاہل ہو یا عالم، غریب ہو یا رئیس، وحشی ہو یا متمدن، غلام ہو یا آقا چوبیس گھنٹہ کے اندر کم از کم پانچ مرتبہ نمازوں میں اپنے رہبر کامل اور خدائے واحد کی حیثیت کو بالاعلان "اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ و اشہد ان محمد عبدہٗ و رسولہ۔ ترجمہ:۔ میں گواہ ہوں کہ خدا ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کا بھی گواہ ہوں کہ محمدؐ اس کے بندہ اور رسول ہیں کہتا ہے۔

نماز کی فلاسفی

اسلام کی اس پنج وقتہ ڈیوٹی کا یہ اثر ہے کہ اس کے رہبر کامل اور خدائے واحد کے پوزیشن پر آجتک کوئی بدنما دھبہ نہ لگ سکا۔ اگر اسلام نماز کو قایم کر کے اس قسم کی پابندیاں نہ کرتا تو دوسرے مذاہب کی طرح اس میں بھی توحید اور رہبر کامل کی حیثیت میں خلط مبحث کا اندیشہ تھا یہ ہی ہے۔ درحقیقت نماز کا فلسفہ جس کو عام لوگ معمولی اطاعت سمجھتے ہیں۔

باب ۱۳

ہر مذہب کے بانی کو تکلیفیں کیوں پہنچائی گئیں۔ اور کس کے حکم سے یہ تکلیفیں پہنچیں جب خدا کریم و عادل ہے تو اِس نے اس کو نیکی کا بدلہ بُرائی سے کیوں دیا

مذہب کے بانیوں کو جو جسمانی تکالیفیں پہنچیں وہ کسی نیکی کے عوض میں نہ تھیں اس لئے یہ اعتراض غلط ہے کہ خدا کریم و عادل ہے تو اس نے نیکی کا بدلہ برائی سے کیوں دیا۔ بلکہ اس کا صحیح سبب یہ ہے کہ بانیان مذہب صبر و تحمل اور استقلال کے نمونے تھے۔ ان کا فریضہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا کہ وہ بنی نوع انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دیں۔ ان کا یہ فریضہ ہے کہ جو کچھ وہ کہیں اس پر عمل کر کے بھی دکھائیں ان کی تعلیم حکمار کی طرح دائرہ تبلیغ تک محدود نہیں ہوتی۔ اگر انہیں مصیبتیں نہ پہنچتیں تو بنی نوع انسان کے لئے کوئی ایسا عملیہ نہ ہوتا جس پر وہ کشادہ پیشانی کے ساتھ چلتے۔ بانیان مذہب مصیبتوں میں کوہ وقار بن کر عام انسانوں کو استقلال و تحمل کا سبق دے گئے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اگر وہ چاہتے تو

مصیبتیں خوشی سے بدل جائیں اور ہمیشہ عمدہ زندگی بسر کرتے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دُنیا کے لئے مفید ثابت ہوتے۔ ہرگز نہیں۔ ان میں اور رؤسائ میں کوئی فرق نہ ہو سکتا جس طرح ہزاروں رئیس دُنیا میں اچھی زندگی بسر کر جاتے ہیں اور پبلک کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اسی طرح اگر انبیار بھی عیش کی زندگی بسر کر جاتے تو عام پبلک کے لئے ان کا عدم و وجود برابر ہوتا۔ حالانکہ بانیان مذہب کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ دُنیا کے لئے کوئی مفید لائحہ عمل تیار کر جائیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ انبیار نے خلاف عادت معجزات کا مظاہرہ کیا جناب ابراہیمؑ نے پرند زندہ کئے۔ جناب موسیٰؑ نے عصا کو اژدہا بنایا۔ جناب داؤدؑ نے لوہے کو موم کیا۔ جناب سلیمانؑ نے ہوا پر تخت اُڑایا۔ جناب عیسیٰؑ نے مردے زندہ کئے۔ پیغمبر اسلامؐ نے کنکریوں کو ناطق بنایا۔

اگر یہ مقدس ہستیاں تکلیفوں میں مبتلا نہ ہوتیں تو لوگ معجزات دیکھکر انہیں خدا کہدیتے۔ تکلیف میں مُبتلا ہونے سے خود بخود اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خُدا نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس کی ذات اقدس ان حوادث سے بالاتر ہے۔ اس مقصد تک پہونچنے کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ان معجزات کا امکان فلسفۂ قدیم و سائنس کے ذریعہ دکھایا جائے۔ تاکہ نئی روشنی کے میدان میں قدم رکھنے والے انبیار کے ان معجزات کو جو ان کے نزدیک محال ہیں ممکن سمجھنے لگیں۔ مجھے اُمید ہے کہ فلسفۂ قدیم و سائنس کے پروفیسر صاحبان غیر متعصب نگاہ سے میرے شکستہ بیان کو دیکھیں گے

جدید سائنس سے قبل معجزات کے متعلق جو کچھ کہا گیا اور جس بنا پر ان سے انکار کیا گیا وہ ایک سفسطہ تھا۔ ہزاروں شکریوں کا مستحق ہے وہ خدا جس نے جدید سائنس کے ذریعہ از سر نو معجزات کی سچائی کا اعلان کیا۔ جن کو دنیا اپنی کم علمی سے جھٹلا چکی تھی اگرچہ اب بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے کہ اگر ان کے سامنے یہ کہا جائے کہ جناب عیسیٰؑ نے مردے زندہ کئے تو کبھی یقین نہ آئے گا۔ اور یہ کہا جائے کہ امریکہ کے ڈاکٹر نے ہسپتال میں بجلی کے ذریعہ مردہ کو زندہ کیا۔ تو فوراً یقین آجائے گا لیکن مادر گیتی جہاں ایسے نالائق فرزندوں کو اپنی گود میں لئے ہوئے ہے وہاں ایسی لائق ہستیوں کو بھی گہوارے میں لوریاں دے رہی ہے جن کی عمیق نظریں سطح ظاہری سے گزر کر واقعات کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ وہ یورپ و ایشیا کے دلدادہ نہیں ہیں بلکہ عقل کے شب چراغ سے تحقیق کرتے ہیں۔

جناب عیسیٰ کا معجزہ اور فلسفۂ قدیم و سائنس

دنیا کے کارناموں میں سب سے تعجب خیز ابن مریم کے اس عمل کو بتایا جاتا ہے جس سے مردہ کو زندہ کیا جاتا تھا۔ کتنے تجربہ کار لوگ گزرے کتنے فلسفی ختم ہوئے۔ ہزاروں دفعہ وقت نے تبدیلیاں کیں لیکن عیسیٰ کے معجزہ کو آج بھی اسی طرح تعجب کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسا کہ زمانہ قدیم میں۔ حالانکہ اس کا امکان و قوع کی حد تک پہنچ چکا ہے۔

نمبر (۱) سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انسان کی موت و حیات کا

معیار کیا ہے۔ فلسفہ قدیم اور سائنس کی بنا پر اصل اصول جسم انسانی میں
حرارت ہے۔ اسی کی فنا و بقا پر موت و حیات موقوف ہیں۔ اگر حرارت یک لخت
یا رفتہ رفتہ کسی جسم کی ختم ہو جائے تو وہ مردہ ہو جائے گا، حرکت، سکون، رفتار،
گفتار، تغذیہ، تنمیہ، غور، فکر سب اسی حرارت کے نتیجے ہیں۔ خون کے دوران
میں جب حرارت نہ ہونے سے کمی واقع ہوتی ہے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ حرارت
بالکل فنا ہو جاتی ہے اور خون کا دوران ختم ہو جاتا ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ جب
حرارت ہی مدار حیات ہے اس لئے اگر اس کو مردہ کے جسم میں پلٹا دیا جائے تو اس
کا زندہ ہونا ممکن ہے۔ میں امریکہ کے مشہور ڈاکٹر کا قول اس کی تائید میں پیش کرتا
ہوں " ڈاکٹر کرائل ماہر سائنس " زندگی اور موت کا دار و مدار بجلی پر ہے۔ اسی
کی وجہ سے ہم سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں جیتے ہیں۔ اسی کے ایما سے تمام
حرکات و سکنات پر سکتہ پڑ جاتا ہے۔ اور جسم کے اجزاء ترکیبی بگڑتے اور منتشر ہوتے
رہتے ہیں۔ اگر جسم کے بگڑنے سے پہلے بجلی لگائی جائے تو مردہ جی اٹھے گا۔ اور
اعضائے رئیسہ کا عمل از سر نو شروع ہو جائیگا۔ اسی نظریہ کی بنا پر ایک سول سرجن
نے مردہ کو زندہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس نے ہسپتال میں دو حوضیں
بنوائیں۔ ایک حوض میں گرم خون اور دوسرا حوض خالی رکھا۔ اور مردے کے جسم
میں دو نلکیاں لگائیں۔ ایک سے مردہ کے جسم میں اچھا خون جاتا تھا اور دوسری
نلکی کے ذریعہ سے خراب خون باہر آتا تھا۔ دیر تک یہ عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ

مردہ نے آنکھیں کھول دیں۔ تاریخ الفلاسفہ مطبوعہ قسطنطنیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم ایمپنیڈس ستاون سال کے بعد زندہ ہوگیا۔ اس نظریہ اور تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی طرح مردہ کے جسم میں بجلی دوڑائی جائے جس سے خون کا دوران ہونے لگے تو مبدء فیاض کی طرف سے پھر اس سے روح کا تعلق ہوجاتا ہے۔ جب ناقص علم کے جاننے والے ڈاکٹر اس حد تک کامیاب ہوجاتے ہیں تو سائنس کا اعلیٰ ماہر اور درس گاہ قدرت کا تعلیم یافتہ انسان مردہ کے زندہ کرنے میں کیوں نہیں کامیاب ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ جناب عیسیٰ اپنی خداداد برقی قوت کو مردہ کے جسم میں پہنچا کر زندہ کرتے ہوں۔

نمبر (۲) علم نفسیات کے ماہرین اس روح پر تصرف کر سکتے ہیں جو ان کے مقابل میں کمزور ہو۔ وہ روح کو بلا سکتے ہیں۔ بات چیت کر سکتے ہیں۔ جس قدر اس فن میں مہارت بڑھتی جائے گی۔ اسی قدر روح پر تصرف کرنے کی طاقت میں بھی اضافہ ہوگا۔ علم نفسیات کوئی تخیل اور تصور خیالی نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض ناواقف لوگ کہتے ہیں۔ یہ غلطی اور دھوکا ہے کہ علم نفسیات قوت متخیلہ کا نتیجہ ہے اور غلطی کا منشا اور اصل اصول وہ عاملوں کے بنائے ہوئے نقش حاضرات اور آلات وانگشتریاں ہیں جن میں جنات اور ارواح کو بلانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے بیشک یہ چیزیں قوت خیالی کے تابع ہیں۔ معمول پر اگر عامل کا اثر ہوگیا تو ان میں کچھ نہ کچھ نظر ضرور آئے گا۔ ورنہ عامل کتنا ہی پڑھے کچھ نظر نہیں آسکتا۔ عامل

کا اثر اس معمول پر ہوتا ہے جو کم سن ہو۔ اسی لئے حاضرات میں دیکھنے والے کے لئے بچہ ہونے کی شرط ہے۔ میں نے اس فن کے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کی جو اپنے کو اسرار الٰہی کا سربستہ راز جانتے تھے۔ اور عامل بے بدل خیال کرتے تھے۔ کسی حاضراتی نے اپنی منفعت مزاجی سے اس کی حقیقت کد و کاوش کے باوجود مجھے نہیں بتائی۔ میں خود بھی اس قدر اس علم سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ لیکن حقیقت سے ناواقف تھا۔ میں بہت دن تک اس نظریہ کے حل کرنے میں غور و فکر کرتا رہا۔ بالآخر میرے ذہن نے یہ ہی تجویز کیا کہ یہ سب قوت خیالی کے کرشمے ہیں۔ ایک روز اس کا تجربہ بھی ہوا۔ سنہ ۱۹۳۴ء کا یہ واقعہ ہے۔ ایک صاحب پریشان حال میرے پاس آئے اور اپنے کسی عزیز کے خط و خرچ نہ بھیجنے سے بے چینی کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے اس امر پر مجبور کیا کہ میں علم النفس کے ذریعہ انہیں یہ بتاؤں کہ ان کے عزیز اچھے ہیں یا بیمار اور اب تک خط و خرچ کیوں نہیں بھیجا۔ ان کا آنے کا بھی قصد تھا۔ میں اس وقت ایک فاضل کے طالب کو مکان پر پڑھا رہا تھا۔ اس لئے ان کی خدمت میں معذرت پیش کی لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔ سچ ہے بندہ کے نزدیک عذر مقبول نہیں۔ جب میں مجبور ہو گیا تو ایک لڑکے کو بلایا۔ جس کا سن بارہ برس سے کم تھا۔ اور اس کے انگوٹھے کے ناخن پر معمولی نیلی روشنائی جو عام طور سے بازار میں ملتی ہے لگا دی۔ میں نے اس بچہ کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ عنقریب

اس میں ایک شخص نظر آئے گا۔ میں برابر اس پر اپنی قوت خیالی کا اثر ڈالتا رہا۔ اور ایک ایک منٹ کے بعد اس خیالی انسان کی آمد کے متعلق دریافت کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد بچہ نے کہا کہ روشنائی میں ایک میدان ہے اس میں ایک شخص سیاہ لباس پہنے کھڑا ہے۔ میں خالی اپنے لبوں کو جنبش دیتا رہا۔ اور عاملوں کی طرح بچہ کو صفائی۔ فرش بچھوانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد شاہ جنات کو بلوایا۔ پھر اس معاملہ کے متعلق ان سے دریافت کیا۔ جواب ملا کہ سائل کے عزیز اچھی طرح ہیں۔ البتہ وہاں نہیں ہیں بلکہ دورہ پر گئے ہیں۔ اسی وجہ سے خط وخرچ نہیں بھیجا چھٹی نہ ملنے سے آنے کا ارادہ بھی ملتوی کردیا۔ کل خط آئے گا۔ خرچ کچھ دن بعد روانہ کریں گے۔ اس پر عمل ختم کردیا گیا۔ تجربہ سے یہ باتیں بالکل صحیح ثابت ہوئیں تب مجھے اس قسم کے عملوں کی حقیقت معلوم ہوئی۔ عاملوں کی شکایت بیجا ہے کیونکہ وہ خود ان کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ پیر صاحب نے جو پڑھایا وہ رٹ لیا۔ اعتقاد کی شرط پہلے ہی ذہن میں اتار دی جاتی ہے تاکہ عامل کی قوت تخیلہ اپنا پورا کام کرے۔ علم نفسیات اس کے برخلاف ایک واقعیت رکھتا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ تخیل کا اس میں بھی دخل ہے تاہم وہ قوت خیالی ہی کی تصویر نہیں ہے۔ علم نفسیات کے ماہرین جب روح پر تصرف کرسکتے ہیں تو وہ روح پر تصرف کیوں نہیں کرسکتا جو قدرت کی طرف سے علم نفسیات کا مالک بن کر آیا تھا۔ اس کو عقل ناممکن نہیں جانتی کہ ابن مریم کی قوت روحوں پر غالب ہو۔ اس

لئے ایسے شخص کا مردہ کو زندہ کرنا محال نہیں ہے۔

نمبر(۳) انسان کی حیات کا دار و مدار عناصر کے اعتدال پر ہے جب اس اعتدال میں فرق آجاتا ہے تو انسان کی عمر کم ہونے لگتی ہے۔ اعتدال کے خاتمہ پر انسان مرجاتا ہے۔ اسی لئے حکما ان دواؤں کا استعمال کرتے ہیں جو مریض کے اعتدال مزاج کو قایم رکھیں۔ سنکھیا کیوں قاتل ہے؟ صرف اس لئے کہ اس کے کھانے سے مزاج میں اعتدال قایم نہیں رہتا۔ اگر سنکھیا اتنی مقدار میں کھایا جائے کہ اعتدال میں فرق نہ آئے تو انسان کبھی نہیں مرسکتا جب معمولی دوائیں غیر معتدل مزاج کو معتدل بنا سکتی ہیں جن پر انسان کی زندگی کا دار و مدار ہے تو وہ انسان غیر معتدل مزاج کو معتدل کیوں نہیں بنا سکتا جو علم روحانیت کا مالک تھا۔ اور جو بوٹیوں میں زندگی کے خواص دے سکتا ہے۔ وہ جناب عیسیٰ کو جو اشرف المخلوقات کی کامل فرد ہیں۔ بطریق اولیٰ زندگی کے خواص دیسکتا ہے اس لئے اگر عیسیٰ کے قدم یا زبان میں زندگی کے خواص مبدء فیاض کی جانب سے ودیعت کر دئے گئے ہوں تو قابل تعجب نہیں ہیں۔ بعض حکماء یونان بھی مردہ کو زندہ کرنا ممکن جانتے تھے اور وہ اس امر کی کوشش بھی کرتے تھے لیکن اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کے متعلق صحیح رائے قایم کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کی تصنیفات کو امتداد زمانہ مٹا چکا ہے۔ آج ہمارے پاس چند پریشان اوراق کے علاوہ کچھ نہیں۔

نمبر (۴) یہ امر بدیہی ہے کہ جسم و روح کے تعلقات کے انقطاع کا نام موت ہے۔ لیکن یہ محال نہیں ہے کہ مرنے کے بعد کچھ دیر تک روح کا جسم سے کسی قدر تعلق باقی رہے۔ اس لئے مردہ کا اس وقت زندہ کرنا جبکہ روح کا دھندلا سا تعلق جسم کے ساتھ ہو۔ ناممکن نہیں ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں کہ مرنے کے بعد روح کا جسم سے تعلق ممکن ہے پروفیسر ہارٹ ہین کی رائے پیش کرتا ہوں۔

"موت کے بعد کچھ دیر تک زندگی کا قایم رہنا ممکنات سے ہے۔ اگر آدمی معمولی موت سے مرتا ہے تو اس حالت میں ایسی بات امر محال ہے۔ لیکن ناگہانی موت یا مرگ قبل از وقت کے موقع پر تندرست اور مضبوط شخص کی زندگی بعد کو بھی کچھ دیر رہ سکتی ہے۔ مضبوط شخص میں سخت جانی ہوتی ہے۔ اور جب اس کا سر جُدا کیا جاتا ہے تو اس کے جسم کے رگ و ریشہ میں مقابلہ کی طاقت ہونے کی وجہ سے زندگی تھوڑی بہت باقی رہتی ہے۔ میں نے ایک پھانسی دیئے ہوئے کی لاش کو چھتیس گھنٹہ کے بعد چیرا۔ اس کے بعض حصوں میں اس وقت بھی جان تھی"۔

پروفیسر ہارٹ کے نظریہ کی بنا پر روح کا مرنے کے بعد جسم سے تعلق رہتا ہے۔ اگرچہ وہ تعلق کمزور ہو جاتا ہے۔ عقلی نقطۂ نظر سے حکمار کے لئے بھی اِن کمزور تعلقات کا قوی بنا دینا ناممکن نہیں ہے۔ کیونکہ بیماری اور موت میں صرف یہ فرق ہے کہ بیماری میں روح اور جسم کے تعلقات کمزور ہوتے ہیں اور موت میں وہ بالکل منقطع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ

کے سر علیحدہ کرنے سے حیات باقی نہیں رہتی۔ نر و مادہ کے ملانے سے نتیجہ
ہوتا ہے۔ حیوانات میں بندر انسان سے زیادہ مشابہ ہے۔ بو علی سینا ا
دیگر حکماء نے سرجری کے بعد یہ طے کیا ہے۔ کہ بندر حیوانات میں سب سے زیا
ترقی یافتہ ہے۔ کیونکہ اس کے اعضاء کی پوری بناوٹ انسان کی سی ہے
مادی طبقات میں ہر طبقہ اپنے قریبی طبقہ کی طرف آسانی سے منتقل ہو سکتا
نباتات حیوان سے زیادہ قریب ہیں اس لئے نباتات کا حیوان ہونا بہ
زیادہ ممکن ہے۔ لہذا اگر موسیٰ کے ہاتھ کا عصا جو نباتات سے تھا اژدہا بن
تو ناممکن نہیں ہے۔ کیونکہ انقلاب و تغیر و ارتقاء مادیات کے خواص
داخل ہے۔

(۳) فلسفہ قدیم کے علاوہ سائنس سے اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ ماہ
کا انقلاب ممکن ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر کرائل نے ایک مردہ جانور کا مغز
اسے بجلی کے ذریعہ خاک کیا۔ پھر اس کے اجزائے ترکیبی کو نکالا اور ان میں
مرکبات کی آمیزش کی یہاں تک کہ اس میں جانور پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر کرائل
تحقیق کی بنا پر جب خاکستر سے حیوان بن سکتا ہے تو نباتات سے حیوان
میں کیا دشواری ہے؟ کیونکہ نباتات و حیوانات کے درمیان وہ تفاوت
ہے جو خاکستر اور حیوان کے درمیان میں ہے۔ ڈاکٹر کرائل ایک خاکستر میں
دوڑائے اور اس سے حیوان بن جائے تو یقین آ جائے اور موسیٰ جو طبیع

اعلیٰ فلاسفر کہلانے کے مستحق ہیں اپنی قوت برتیہ عصا میں دوڑا کر اژدہا
یں تو دُنیا تعجب کرنے لگے۔ یہ درحقیقت دُنیا والوں کی تنگ نظری کی دلیل
ڈاکٹر کرائل کے علاوہ انقلاب ماہیت کے مختلف تجربے کئے گئے ہیں
بڑی لکڑیاں لیکر شیشہ کے برتن میں ڈالدی جائیں اور ان پر گدھی
ودھ اس قدر چھڑکا جائے کہ وہ ڈوب جائیں۔ پھر برتن کو بند کرکے لید میں
یا جائے اور ہر چوتھے روز لید بدلتے رہیں تو چار ہفتہ کے بعد اس میں سانپ
ا ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ گوبر اور متعفن غذا میں خود بخود کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں

...اب موسیٰ کا عصا ...ژدہا ہی کیوں بنا

انقلاب ماہیت کے ثبوت کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جناب موسیٰ کے عصا نے اژدہے ہی کی صورت کیوں اختیار کی ممکن تھا کہ وہ دوسری
کل اختیار کرکے حریفوں کے سانپوں کو نگل جاتا۔ اس جواب کو نظر انداز کرتے
ئے کہ مقابلہ ہم جنس کا ہوتا ہے۔ شیر کے مقابلہ میں شیر اور سگ کے مقابلہ میں
ک اور بلی کے مقابلہ میں بلی آتی ہے۔ اس لئے سانپوں کے مقابلہ میں قدرتا
اسانپ آنا چاہیئے تھا۔ تاکہ حریفوں کا صحیح جواب ہوتا۔ میں اپنے تجربہ کی بنا پر
عرض کرتا ہوں کہ نباتات میں شکل اور طبیعت کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ایسی
صوصیتیں ہیں جن کا تعلق خاص حیوانوں اور انسانوں سے ہے۔ بعض
پھلواریوں کو دیکھا ہے کہ وہ فطرتاً بعض جانوروں کی شکل کی ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض

پانی میں حل کر کے ڈالدیں۔ اور برتن کا منہ مضبوط بند کر کے گھوڑے کی لید میں دفن کر دیں۔ چالیس روز کے بعد فولاد موم کی طرح ہو جائے گا۔ اسی طرح لوہے کے برادہ میں اگر سرکہ ڈالدیا جائے اور کچھ دن اس کو دھوپ میں رکھا جائے تو لوہا موم کی طرح نرم ہو جائے گا۔ چنانچہ بعض کیمیاگر سرکہ کے ذریعہ سے فولاد کے برادہ کو موم بناتے ہیں۔ اس کو طبی اصطلاح میں زعفران الحدید کہتے ہیں۔

لوہے کا موم بنادینا تو درکنار، اہل کیمیا اس کو پانی بھی بنا دیتے ہیں چنانچہ مشہور فلاسفر براکلیوس نے لوہے کو پانی کرنے میں تجربہ کیا ہے۔ "لوہے کے بُرادے کو سات بار نمک آمیختہ پانی میں ایک ایک پہر کھرل کر کے عرق گندھک ایک جز اور خالص پانی دو جز باہم ملاکر برادۂ مذکور کو اس میں ملادیں اور آتشی شیشی میں بند کر کے گرم جگہ میں رکھیں۔ یہاں تک کہ سب حل ہو جائے۔ خشک ہونے پر جوہر اڑائیں اس جوہر کو اس شیشی میں بند کر کے نمناک زمین میں دفن کر دیں۔ اس ترکیب سے لوہا پانی بن جاتا ہے۔

جب معمولی مہوسین اور اہل کیمیا لوہے اور دیگر معدنیات کو موم اور پانی بنا دیتے ہیں۔ تو خدائی طاقت لیکر آنے والا لوہے کو موم کیوں نہیں بنا سکتا ممکن ہے کہ قدرت نے جناب داؤد کے ہاتھ میں ان بوٹیوں کے خواص عطا کئے ہوں جو لوہے اور دیگر معدنیات کو موم اور پانی بنا دیتی ہیں۔ اس کے

علاوہ لوہے کا نرم ہونا اور زرہ وغیرہ بنانا آلات اور بوٹیوں پر ہی موقوف نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ زرہ وغیرہ کے بنانے والے کی طاقت لوہے کے اجزائے ترکیبی پر غالب پر ہو۔ اس لئے آلات اور بوٹیوں کی اعانت کے بغیر لوہا موم کی طرح نرم ہو سکتا ہے۔ یا اگر انسان کے تمام جسم میں طاقت نہ ہو لیکن پنجہ میں لوہے سے زیادہ زور ہو۔ اور اس کی قوت اس پر غالب ہو تو وہ لوہے کو آسانی سے توڑ کر زرہ بنا سکتی ہے۔

میں نے خود ایک شخص کو دیکھا ہے جس کے جسم میں زائد طاقت نہ تھی مگر اس کے پنجہ میں اس قدر طاقت تھی کہ پیسہ کو دو انگلیوں سے موڑ دیتا تھا۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ جناب داؤد کے پنجہ میں اس قدر طاقت دی گئی ہو کہ جس کے مقابل میں لوہا کمزور ہو۔ لہذا نرم ہو جاتا ہو۔

جناب سلیمانؑ کا معجزہ اور فلسفۂ قدیم و سائنس

جناب سلیمان کا ہوا پر تخت اُڑانا جس قدر دشوار معلوم ہوتا تھا اتنا ہی آسان ہو گیا جس قدر گراں تھا اُسی قدر سہل بن گیا۔ اب سے کئی صدی پہلے اس کو مردہ کے زندہ کرنے سے کم مشکل نہیں سمجھا جاتا تھا بڑے بڑے مدبرین نے غور کیا۔ ماہرین نے فکریں کیں۔ مگر عقل کبھی امکان کی بلندی تک پہنچی۔ کبھی رسائی سے پہلے ہی تھک کر گر گئی۔ جدید تحقیقات نے ان تمام سربستہ رازوں کا انکشاف کر دیا۔ جو ابھی تک عقل کی عقدہ کشائی کے

نہ کرسکتا جب معمولی انسان کی ترکیب دی ہوئی حرارت ہزاروں من بوجھ کو ہوا کے دوش پر اڑا سکتی ہے تو جناب سلیمان کی قوت برقیہ تخت کو کیوں نہیں اُڑا سکتی۔

ہَوا اپنے سے زیادہ وزن کو اٹھا سکتی ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق بحث کرنا وزن کی حقیقت کے انکشاف پر موقوف ہے۔ فلاسفران قدیم کے نزدیک وزن کسی شے کے میلان مرکزی کو کہتے ہیں۔ مثلاً ایک بڑا پتھر چھوٹے پتھر کی بہ نسبت وزنی کہلاتا ہے۔ یا خاک کا بڑا ڈھیر چھوٹے ڈھیر کی بہ نسبت وزنی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ بڑے پتھر اور بڑے خاک کے ڈھیر کا میلان چھوٹے پتھر اور چھوٹے خاک کے ڈھیر کی بہ نسبت نقطۂ مرکزی کی طرف زیادہ ہے۔ اسی لئے تولنے یا اُٹھانے میں پہلی دونوں چیزوں کا وزن زیادہ محسوس ہوگا۔ اس بنا پر یہ شبہ ضرور ہوتا ہے کہ ہَوا اپنے سے زیادہ وزن کو کیوں کر اٹھا سکتی ہے۔ مگر یہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ایک معمولی ڈھیلے کو ہَوا نہیں روک سکتی جبکہ حرارت جس کا میلان بالطبع اوپر کی طرف ہے اپنی طاقت سے اس کمی کو پورا کرتی ہو۔ وزنی شے میلان مرکزی کی وجہ سے نیچے کی طرف آتی ہے۔ لیکن حرارت اس میلان مرکزی کی مانع ہو جاتی ہے اس لئے ہوائی جہاز اپنی حرارت کی بنا پر بلند ہوتا جاتا ہے۔ اہل سائنس کے نزدیک وزن کوئی مستقل شے نہیں ہے۔ وہ زمین و آفتاب اور دیگر سیاروں

کی باہمی جذب وکشش کو وزن کہتے ہیں۔ بڑے پتھر کا وزن بہ نسبت چھوٹے پتھر کے زیادہ ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ زمین کا اثر کشش بڑے پتھر پر زیادہ پڑتا ہے۔ وزن کو امر اضافی تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال خود بخود برطرف ہو جاتا ہے کہ ہوا اپنے سے زیادہ وزن کو اٹھا سکتی ہے یا نہیں۔ اب دیکھنا صرف کشش کا ہے۔ اگر بالا کی طرف کشش زیادہ ہے تو جس شے پر کشش کا اثر ہے وہ اوپر کی طرف جائے گی۔ اور اگر ماتحت کی طرف کشش ہو رہی ہے تو وہ نیچے کی طرف آئے گی۔ اگر کوئی شے اس حد تک پہنچ جائے جہاں زمین کی کشش ختم ہوتی ہے تو وہ بغیر کسی حرارت کے اوپر کی طرف چلی جائے گی۔ کیونکہ قریبی سیارے کی کشش اس کو اوپر کی طرف کھینچ لے گی۔ جب انسان کا بنایا ہوا ہوائی جہاز جذب وکشش کے ماتحت اُڑ سکتا ہے۔ تو جناب سلیمان کا بنایا ہوا جہاز جس میں قدرتی قوت برقیہ موجود تھی بطریق اولے سطح ہوا کی سیر کر سکتا ہے۔

پیغمبر اسلام کے ہاتھ میں کنکریوں کا بولنا۔ اور فلسفہ قدیم وسائنس

اگر چہ یہ تعجب خیز امر ہے۔ کہ بے جان کنکریاں اور بے زبان درخت رسول سے کیونکر ہمکلام ہوئے۔ لیکن فلسفۂ قدیم وسائنس کے نظریہ کی بنا پر بولنے کے لئے جان اور زبان کی شرط نہیں ہے۔ پہلے بھی کبھی دُنیا نے بے جان چیزوں سے آواز

اس طویل تمہید کے بعد پھر میں اپنے مقصد اعلیٰ کی طرف عود کرتا ہوں بہت ممکن تھا کہ عوام الناس جنہیں ان خرق عادت اعمال کی حقیقت اور اسباب معلوم نہیں ہیں معجزات دیکھ کر انبیاء کو خدا کہدیتے۔ اس لئے انبیاؑ کا تکلیفوں میں مبتلا ہو کر خدا کی درگاہ میں دعا کرنا اس امر کی تبلیغ تھی کہ ہم خدا نہیں ہو سکتے۔ الوہیت اسی کے لئے زیبا ہے جو کسی کے ماتحت نہیں۔

اس کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کو تکلیف پہنچانے کے ذمہ دار متعصب اور خود غرض لوگ ہیں۔ لہٰذا خدا یا انبیاء پر الزام قایم نہیں ہو سکتا۔

باب ۱۴

قیامت کیا ہے۔ اِس کے امکان کا کیا ثبوت ہے اور اگر ممکن ہے تو اب تک کیوں نہیں ہوئی۔ اور کب ہوگی مرنے والوں کی روحیں اب تک بہشت میں پہنچیں یا نہیں۔ اگر نہیں پہنچیں تو اِس وقت کہاں رہتی ہیں اور ان کے اعمال کا فیصلہ کب تک زیر تجویز رہے گا۔
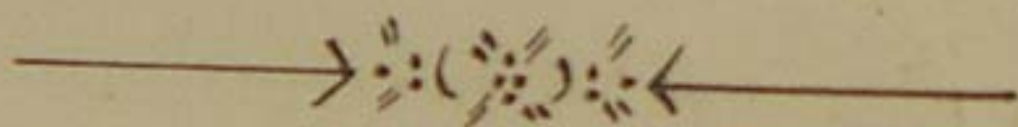
یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ تمام کائنات عالم حکیم مطلق کے فعل کا نتیجہ ہیں۔ ماننا ہوگا کہ بنانے والے نے اپنی مخلوقات کے لئے کوئی مفید دستور العمل بنایا ہے جس پر عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے والوں میں فرق ہو۔ درحقیقت وہی معیار نجات ہے۔ قدرتی دستور العمل پر عمل کرنے والوں اور عمل نہ کرنیوالوں کا آخری نتیجہ وہی ہے جس کو قیامت کہتے ہیں۔ قیامت کوئی انوکھی اور عجیب و غریب چیز

نہیں ہے جس کے سُننے سے دل گھبرائے، خون کھولے، دماغ پریشان ہو طبیعت میں الجھن بڑھے۔ بلکہ رات دن جو چھوٹے چھوٹے تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہی کبھی عظیم الشان صورت اختیار کریں گے۔ اسی کا نام قیامت ہے۔ دُنیا میں کوئی لمحہ، کوئی ساعت، کوئی گھڑی ایسی نہیں جس میں انقلاب اور تغیرات نہ ہوں۔ وہ ہوا چلی۔ وہ گھٹا اٹھی۔ وہ بادل گرجا۔ وہ بجلی کڑکی۔ وہ ننھی ننھی پھوار پڑی۔ وہ موسلا دھار پانی برسا۔ ابھی ابھی کچھ نہ تھا اور سب کچھ ہو گیا۔ درخت مرجھا چکے تھے۔ پھول کُملا چکے تھے۔ زمین خشک تھی۔ سبزہ زار چٹیل میدان تھے۔ دفعۃً کا یا پلٹ ہو گئی۔ درختوں نے خلعت نو پہنے۔ پھول ہنسے۔ کلیاں مُسکرائیں۔ زمین سبزہ پوش ہوئی۔ پھر وہی چمن۔ وہی بُلبُل کے نالے۔ وہی باغوں کی رونق۔ وہی پرندوں کی نغمہ سنجیاں۔ لوؤں کے مارے جی گئے آندھیوں کے برباد ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ مردہ درختوں میں جان آئی۔ طبیعتوں میں اُمنگ پیدا ہوئی۔ واہ رے دُنیا کے انقلابات۔ دیکھتی آنکھوں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہی چھوٹے چھوٹے تغیرات مل کر کبھی بڑا تغیر بن جائیں گے۔

قیامت کی ضرورت

انسان کے اعمال کا صحیح طور سے جائزہ لینے کا وقت قیامت کے نام سے موسوم ہے۔ جہاں تک عقل اور تجربہ ہماری رہنمائی کرتا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دُنیا میں انسان کے اعمال کا صحیح طور پر جائزہ نہیں لیا جاتا۔ اسلامی عیسوی۔

ہندی عدالتیں کھلی ہوئی ہیں۔ انصاف کرنے والے جج کرسیوں پر بیٹھے غور و
خوض کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی برابر جھوٹے حلف اٹھائے جاتے ہیں غلط قسمیں
کھائی جاتی ہیں۔ مدعی اور مدعا علیہ اپنے تحفظ کے لئے جھوٹے گواہ اور ثبوت
بہم پہنچاتے ہیں۔ عدالتوں میں کافی تحقیقات اور قانونی روک ٹوک کے باوجود
ظالم مظلوم اور مظلوم ظالم بن جاتا ہے۔ بیگناہ کو پھانسی لگتی ہے اور گنہگار بچ
جاتا ہے۔ چور رہا ہو جاتا ہے اور محافظ گرفتار کیا جاتا ہے۔ اکثر دو آدمیوں میں
جھگڑا ہوتا ہے۔ عدالت عالیہ میں جاکر نیک مارا جاتا ہے اور بد چھوٹ جاتا ہے
بلکہ ہر معاملے میں نیک کے طرفدار کم ہوتے ہیں۔ اور بد کے جانبدار بکثرت پھر
راز سوچیے۔ معاملہ کو صاف کیجیے۔ گواہ مانگئے۔ سی، آئی، ڈی ان کے پیچھے چھوڑیے
لیکن اصل معاملہ کی تہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے اس دُنیا میں حقیقی انصاف بھی
ناممکن ہے۔ لہذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ موجودہ نظام عالم کے علاوہ کوئی ایسا دن ہونا
ضروری ہے جس میں نیکی اور بدی، صفائی اور مکاری۔ دوستی اور دشمنی غیرُیت
اور اپنائیت باہم مشتبہ نہ ہوں۔ یہاں تک کہ ہر بدی نیکی سے علیحدہ ہو۔ اور
عصمت گناہ سے ممتاز نظر آئے۔ اسی کو مسلمان قیامت کہتے ہیں۔ اب قیامت
کی یہ تعریف ہوئی کہ وہ مخلوقات کے اعمال کے صحیح جائزہ لینے کا دن ہے۔ یہ ہی
قرآن کا اعلان ہے۔

ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ ترجمہ:۔ جو

شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا اُس کا عوض پائے گا۔ اور جو شخص ذرہ برابر گناہ کرے گا اس کا بدلہ ملے گا۔

درحقیقت قیامت ہی وہ عالم ہے جہاں صحیح اور حقیقی انصاف ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس دُنیا میں پاکیزہ نفس ہستیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوئے اور اکثر بے گناہ ہی ستائے گئے۔ لیکن نہ اس کے مرتبہ میں افزائش ہوئی اور نہ ظالموں کو سزا ملی۔ اور اگر سزا ملی یا نیکوں کو جزا دی تو اس قدر نامکمل کہ اس کو حقیقی عوض نہیں کہہ سکتے۔ اس کے برخلاف قیامت میں ظالم اور مظلوم۔ نیک و بد وغیرہ کی شخصیتیں نمایاں ہوں گی۔ اور جزا و سزا کی تکمیل ہو گی۔ آواگون کے تسلیم کرنے میں سب سے بڑی مشکل پیش آتی ہے کہ مجرم سے گناہ کا اقرار نہیں لیا جاتا۔ نہ ان کو فردِ جرم بتائی جاتی ہے۔ لیکن قیامت کے وسیع میدان میں عدالت عالیہ الٰہی کی جانب سے مجرموں کو فردِ جرم بتائی جائے گی۔ اور ان سے گناہوں کا اقرار لیا جائے گا۔ وہ اپنے اعمال اور جزا و سزا کا توازن خود کریں گے۔

قیامت کے متعلق ایک ہندو پروفیسر کے شبہ کا جواب اعمال کا تُلنا اور سائنس

مجھ سے ایک پروفیسر نے کہا کہ قیامت دنیوی جزا و سزا سے کہیں بہتر ہے اور اس کا ہر شخص کو قائل ہونا چاہیئے بشرطیکہ اس میں حقیقتاً وہ انصاف کیا جائے جس کی اطلاع قرآن نے دی ہے۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ ترجمہ:

ہر شخص ذرہ برابر نیکی اور بدی کا عوض پائے گا۔" لیکن اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کیونکہ دُنیا میں یقین نہیں کہ کسی مقدمہ میں اس قدر انصاف میں ڈوبا ہوا فیصلہ کیا گیا ہو۔ آواگون کی بنا پر بھی مذہبی عقیدہ کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ دُنیا میں حقیقی انصاف ہوتا ہے۔ ورنہ عقل اپنے تجربہ کی بنا پر کامل یقین نہیں رکھتی۔" میں نے عرض کیا کہ دُنیا میں صحیح انصاف کی نظیر نہ ملنے سے ہی مجبوراً عقل کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ صحیح جزا و سزا کا عالم دوسرا ہے۔ اسی لئے اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ دیگر اصول محمدی کی طرح قیامت بھی عقلی استدلات کا نتیجہ ہے۔

رہا یہ امر کہ ذرہ برابر نیکی اور بدی کا توازن کیونکر ہو گا۔ اور عوض کیوں کر دیا جائے گا۔ ذرہ کی مقدار ہی کیا ہے۔ سائنس نے اس کا جواب دیا ہے۔ دور حاضرہ میں تولنے کے لئے ایک ایسی مشین بنائی گئی ہے جو پنسل سے بنایا ہُوا چھوٹے سے چھوٹا نقطہ بتا دیتی ہے۔ فرض کیجئے اس میں ایک سادہ کاغذ رکھا اور تولا۔ پھر پنسل سے اس پر نقطہ لگایا۔ تو اب کاغذ کا وزن پہلے کی بہ نسبت بڑھ جائے گا۔ جب کمزور مخلوق کی نگاہ اس قدر باریک بیں ہے تو قدرت کی نگاہ کس قدر دقیقہ رس ہو گی۔ مخلوق و خالق کے علم میں کوئی نسبت نہیں۔ اس لئے ہر اہل عقل یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا کہ جب مخلوق کو ذرہ ذرہ کا علم ہوتا ہے تو خالق جس کے علم کی نسبت مخلوق کے علم سے وہی ہے جو وجود کو نسبت عدم سے بطریق اولیٰ ہر ذرہ کا علم رکھتا ہے۔ جب وہ ہر ذرہ کا عالم ہے تو قرآن کے اِعلان

کی بناپر ہر ذرہ کا معاوضہ دے گا۔ عام اس سے کہ انسان کمی مقدار کی وجہ سے
اس کو محسوس کر سکے یا نہ کر سکے۔ فرض کیجئے دس سیر لوہے پر ایک پنسل سے نقط
لگا دیا جائے۔ گو وہ کمی مقدار کی وجہ سے محسوس نہ ہوگا۔ تاہم اس سے انکا
نہیں ہو سکتا کہ اس لوہے کے وزن میں اضافہ ہوا۔ یا کسی مکان سے ایک چاول
کی مقدار سیمنٹ کھرچ ڈالئے بڑے سے بڑا انجنیر اس مکان کو دیکھے گا تو پاس کرکے
چلا جائے گا۔ اگرچہ کمی مقدار کی وجہ سے سیمنٹ کا نقصان انجنیر کو محسوس نہ ہوگا
لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک چاول کی برابر مکان سے کمی ضرور ہوئی"۔

پروفیسر صاحب نے میری پریشان تقریر کو پسند کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام
کا سائنس سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔ اگر مسلمان مناظرانہ مجادلانہ طرز کو چھوڑ کر
اس طرح اسلام کی خوبیاں سائنس اور فلسفہ سے بیان کریں تو غیر مسلم اقوام کو صحیح
فیصلہ کرنے کا موقع ملتا رہے"۔

قیامت کے امکان کا ثبوت

اس سے پیشتر میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ قیامت ان
چھوٹے چھوٹے تغیرات کے عظیم الشان صورت اختی
کرنے کا نام ہے۔ جو روز مرہ ہمارے سامنے ہوتے رہتے
ہیں۔ قیامت کے ثبوت کے لئے میرے ناقص دماغ کی فضا میں سائنس اور فلس
کی بکثرت دلیلیں ہیں۔ ان میں سے چند کو مختصر طور پر عرض کرتا ہوں۔

(۱) ہر حرکت کرنے والی شے جب یکلخت رک جاتی ہے تو ان جاندارں

جانی صدمہ ہوتا ہے جو اس کی سطح پر ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ریل تقریباً تیس یا چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ جب اسٹیشن تقریباً دو میل رہجاتا ہے تو ڈرائیور انجن کو سلو کر دیتا ہے۔ تاکہ اسٹیشن پر پہنچ کر مسافروں کو دفعتاً دھکا نہ لگے۔ آہستہ کرنے کے باوجود بعض اوقات مسافر اپنی سیٹ سے نیچے گر جاتے ہیں اور زخمی ہو جاتے ہیں۔ اگر انجن اپنی رفتار کے ساتھ جارہا ہو اور دفعتاً اس کو روک دیا جائے تو کس قدر جانیں تلف ہوں گی۔ میرے خیال ناقص میں شاید ہی کوئی بچے۔ یہ ایک معمولی رفتار والے انجن کی حالت ہے۔ اگر زمین جس کی رفتار فی سیکنڈ کروڑوں میل ہے کسی وجہ سے دفعتاً رُک جائے تو یقیناً تمام ذی روح ٹکرا کر مرجائیں گے۔

(۲) معمولی رفتار والی ریلیں جب کبھی اتفاقاً متصادم ہوتی ہیں تو لاکھوں مسافروں کا خون ہوتا ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ زمین اور دیگر سیاروں کی نسبت ریل سے وہی ہے جو حرکت کو سکون سے ہے۔ اگر کسی وجہ سے ایک سیارہ دوسرے سے ٹکرا جائے تو یقیناً کوئی ذی روح ان سیاروں میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ فرض کیجئے زمین کسی وجہ سے مریخ سے ٹکرا جائے تو یہ ناممکن ہے کہ ان میں رہنے والوں کا نشان بھی باقی رہے۔ یا زمین چاند یا زحل وغیرہ سے ٹکرا جائے تو محال ہے کہ ذی روح زندہ رہیں۔ سیاروں کے باہمی متصادم ہونے کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں جذب و کشش جو قدرتی طور پر ودیعت ہے

کسی وجہ سے ختم ہو جائے۔ اس لئے وہ آپس میں ٹکرا جائیں۔ کیونکہ ہر دوری حرکت کرنے والا جذب مرکزی کے تابع ہوتا ہے۔ جذب مرکزی کے منقطع ہوتے ہی۔ متحرک پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ حرکت مستقیم کرتا ہے۔ جس طرح بچے کے ہاتھ میں لٹو گھومتا ہے۔ رسی کا ایک سرا بچہ کے ہاتھ میں اور دوسرا سرا لٹو سے بندھا ہوتا ہے۔ اگر بچہ لٹو کو گھماتے وقت چھوڑ دے تو لٹو حرکت مستقیم کرتا ہوا کسی دیوار یا انسان سے متصادم ہو جائے گا اسی طرح جذب مرکزی منقطع ہوتے ہی۔ زمین اور دیگر سیارے خط مستقیم پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ باہم ٹکرائیں گے۔ اس وقت دُنیا کا زندہ رہنا محال ہے

(۳) شہب ثاقب جب زمین تک پہنچ جاتے ہیں تو سطح زمین کی ہر چیز کو خاکستر بنا دیتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں سائبریا میں ایک شہاب ثاقب گرا۔ جس نے گیارہ ہزار مربع میل تک تمام جاندار اور بے جانوں کو خاکستر بنا دیا۔ اسی طرح اگر اسباب سماوی یا ارضی کی وجہ سے زمین پر شہاب ثاقب بکثرت گرنے لگیں تو قیامت آجائے۔ کیونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ اس وقت کوئی شے زندہ رہے۔

(۴) سائنس کے نظریہ کی بنا پر روز بروز زمین سرد ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر آنے والے زمانہ میں گزشتہ زمانہ کی بہ نسبت اس کو آفتاب سے بعد ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے حکما کا یہ خیال ہے کہ شاید آخر میں خط استوا کے قریب

آبادی رہ جائے۔ اور وہ اس قدر گھمسان آبادی ہوگی کہ چند گز زمین کو بڑی قیمت
کے ساتھ دیکھا جائے گا۔ اس نظریہ کے اعتقاد کے ساتھ یہ بھی ماننا ہوگا کہ زمین
اور آفتاب کے درمیان جذب وکشش کا سلسلہ کم ہوتا جاتا ہے۔ ورنہ
زمین آفتاب سے روز بروز دور نہ ہوتی۔ رفتہ رفتہ جب زمین آفتاب سے
اس قدر بعید ہو جائے گی۔ کہ اس تک حرارت شمسی کا اثر نہ پہونچے گا۔ تو
اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات فنا ہو جائے گی۔

قیامت میں پیغمبر اسلام کی حدیث کے مطابق سورج کا زمین سے سوا نیزہ پر ہونا اور فلسفہ وسائنس کی پُرزور تائید

(۵) اکثر اہل سائنس
کا عقیدہ ہے کہ زمین
آفتاب کی طرف کھنچ
رہی ہے۔ کیوں کہ یہ
آفتاب کا ایک ٹکڑا
ہے۔ فلاسفران قدیم نے بھی اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ روزانہ زمین کا وہ مدار
جس پر وہ آفتاب کے گرد چکر لگا رہی ہے چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے وہ
آفتاب کے قریب ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ گرمی گزشتہ
گرمی سے زیادہ ہے۔ چشمہ بھی بکثرت سوکھتے جاتے ہیں۔ آفتاب کی کشش کا
اثر زمین پر ہوتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت سمندر کا مدوجزر ہے۔ جس سے کسی
کو انکار نہیں ہو سکتا۔ آفتاب اور چاند پانی اور زمین کو اپنی طرف کھینچتے ہیں پانی

بہ نسبت زمین کے لطیف ہے۔ اس لئے اس پر اثرات جلدی ظاہر ہو جاتے
ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آفتاب کی کشش بہ نسبت چاند کے قوی ہے۔ اس لئے
زمین کھنچتے کھنچتے جب آفتاب کے بالکل قریب ہو جائے گی۔ تو حرارت شمسی
سے تمام ذی روح مر جائیں گے۔ ابیقور فلسفی دہریہ ہونے کے باوجود اس ام
کو تسلیم کرتا ہے کہ دُنیا کا عظیم الشان تغیر جو فنا کے مرادف ہے۔ کبھی آفتاب
کے زمین سے قریب ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے
کہ آفتاب کا زمین سے قریب ہونا ممکن ہے۔ یہیں سے پیغمبر اسلام کے اس
مقدس قول "قیامت میں آفتاب سوا نیزہ پر ہوگا" کی تصدیق ہوتی ہے

ایک سائنس داں کا اعتراض اور سبزواری کا جواب

ایک ماہر سائنسداں نے مجھ سے
دریافت کیا کہ پیغمبر اسلام کی یہ حدیث
"آفتاب قیامت میں سوا نیزہ پر ہوگا"
اہل فلاسفہ کے اس قول "زمین آفتاب سے بعید ہوتی جاتی ہے اسی لئے
اس پر آیندہ زمانہ میں اس قدر سردی ہوگی کہ کوئی ذی روح زندہ نہیں رہ سک
کے خلاف ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اکثر فلاسفران قدیم اور ماہرین علم ہیئت
اور اہل سائنس کا نظریہ ہے۔ بلکہ ماہرین علم ہیئت اس کو مشاہدہ بتاتے ہیں
کہ زمین آفتاب سے دور ہونے کے بجائے قریب ہوتی جاتی ہے اور اس کا
مدار جس پر وہ آفتاب کے گرد گھومتی ہے چھوٹا ہو رہا ہے جیسا کہ میں بیان

کر چکا ہوں۔ ان کے مقابل میں اُن حکمار کی تعداد قلیل ہے جو زمین کے آفتاب سے بعید ہونے کے قائل ہیں۔ اہل جغرافیہ بھی اس امر کا اقرار کرتے ہیں۔ بہت سے جھیلیں اور چشمہ حرارت شمسی کی وجہ سے خشک ہوگئے بعض اہل فلسفہ نے تو اس خیال میں یہاں تک ترقی کی کہ دُنیا آخر میں پیاسی مر جائے گی۔

اس کے علاوہ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ زمین برابر آفتاب سے بعید ہوتی جاتی ہے۔ تب بھی پیغمبر اسلام کے اس قول "قیامت میں آفتاب سوا نیزہ پر ہوگا" کے مخالف نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ ممکن ہے بلکہ اس نظریہ کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ جب زمین آفتاب سے اس قدر بعید ہو جائے کہ جذب مرکزی کا اس پر اثر نہ رہے تو وہ کسی دوسرے سیارے سے ٹکرائے جو ہمارے نظامِ شمسی کے ماتحت نہ ہو۔ کیونکہ جب تک کوئی سیارہ اپنے نظام شمسی کے ماتحت ہے دوسرے سیارہ سے جو اسی نظام کے ماتحت ہے عارضی اور اتفاقی اسباب کے علاوہ نہیں ٹکرا سکتا۔ اس لئے زمین جذب مرکزی کے اثر سے نکل کر خطِ مستقیم پر دوسرے سیارہ سے ٹکرائے گی۔ جو دوسرے نظام شمسی کے ماتحت ہو۔ یہ بھی مشاہدہ ہے کہ جب دو سریع السیر چیزیں مثلاً ریل، موٹر باہم متصادم ہوتے ہیں، تو ان کے اجزا اور پُرزے دھنکی ہوئی روئی کی طرح اُڑ اُڑ کر کافی فاصلہ پر گرتے ہیں۔ اسی طرح جب زمین اپنی پوری طاقت

کے ساتھ دوسرے سیارہ سے ٹکرائے گی تو اس کے اجزا مثلاً پہاڑ وغیرہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہوا پر اڑتے نظر آئیں گے۔ یہیں سے خدا کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ قیامت میں پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہوا پر اڑیں گے۔" تحقیق کے اس مقام تک پہنچ کر عقل سلیم اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ زمین اپنے نظام شمسی سے علیحدہ ہو کر جب دوسرے شمس کے ماتحت جائے تو وہ حرارت سے اپنی طرف کو اسے کھینچ لے۔ یا زمین کا بڑا حصہ پھٹکر خود حرکت قسری سے جو دوسرے سیارہ کی ٹکر سے حاصل ہوئی ہو اس آفتاب کے قریب چلا جائے۔ اسی لئے ہر صورت میں قیامت میں آفتاب زمین کے قریب ماننا ہوگا۔ یہ ہی مقصد پیغمبر اسلام کا ہے نہ یہ کہ حقیقتاً آفتاب کی بلندی کی پیمائش سوا نیزہ ہے۔

اس قسم کے محاورات دُنیا کی تمام زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اُردو میں کہا جاتا ہے کہ ڈیڑھ بالشت کا آدمی ہے لیکن آپے سے باہر ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ حقیقتاً حریف ڈیڑھ بالشت کا ہے۔ کیونکہ آج تک اس قدر مختصر مقدار کا انسان کانوں نے نہیں سُنا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ حریف بہت ہی چھوٹے قد کا ہے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام کا مقصد سوا نیزہ سے پیمائش نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ آفتاب زمین سے بہت زیادہ قریب ہو جائے گا۔"

(۶) تجربہ شاہد ہے کہ معمولی زلزلوں سے شاہی محل مضبوط مکان۔ مستحکم

یوانخانے گر جاتے ہیں۔ زلزلہ کے ساتھ کبھی زمین شق ہو جاتی ہے۔ اور آتشی
دہ برآمد ہوتا ہے۔ جس کو کوہ آتش فشاں کہتے ہیں۔ جاپان۔ کوئٹہ۔ بہار۔ میں
وہ آتش فشاں پھٹنے سے جو جانی اور مالی نقصان ہوا۔ وہ قیامت صغریٰ کا
نمونہ تھا۔ ہزار دو ہزار نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں وہ قیامت کی طرح برباد
ہو گئے۔ جاپان۔ کوئٹہ۔ بہار۔ آج تک آبادی کے سر سبز نقش کے مٹے ہوئے
نشان ہیں۔ ان مقاموں پر جب زلزلہ آیا تو دفعتاً کایا پلٹ ہو گئی۔ حقیقتاً ان
زلزلوں کو قیامت کا منظر کہنا چاہیے۔

اہلِ سائنس کے نزدیک زمین روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہے۔ اسی لئے
پہلے کی بہ نسبت زلزلوں کی کثرت ہو رہی ہے۔ قانون فلسفہ و سائنس کے مطابق
جس قدر زمین کمزور ہوتی جائے گی۔ اسی قدر زلزلوں کی کثرت ہوگی۔ لہذا جب
رفتہ رفتہ زمین میں عالمگیر کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ تو زلزلہ بھی عالمگیر ہوگا یہی
درحقیقت قیامت ہے۔ اس عالمگیر زلزلہ کا نتیجہ ان معمولی زلزلوں سے معلوم
ہو سکتا ہے۔ تجربہ اس امر کا شاہد ہے کہ بہار، کوئٹہ، جاپان کے معمولی زلزلہ
نے لاکھوں جانیں ایک منٹ میں تلف کر دیں۔ تو قیامت کا غیر معمولی زلزلہ کب
اس قابل ہوگا کہ جس میں ایک متنفس کے بچنے کی بھی دھندلی سی اُمید کیجا سکے
بلکہ یقین ہے کہ اس غیر معمولی زلزلہ سے جس میں کوہ آتش فشاں بھی بکثرت
ہوں گے کوئی ذی روح نہیں بچ سکتا۔ زمین کے عالمگیر زلزلہ کے علاوہ کوہِ

آتش فشاں ہی جانداروں کے فنا کے لئے کافی ہیں۔ کیونکہ معمولی کوہ آتش فشاں سینکڑوں میل تک بستیوں کو خاکستر بنا دیتا ہے۔ اس لئے اس غیر معمولی کوہ آتش فشاں سے کیونکر کسی کو پناہ مل سکتی ہے۔ جو زمین کے گوشہ گوشہ سے پیدا ہوگا۔

قرآن نے بھی قیامت میں زلزلہ اور کوہ آتش فشاں کی خبر دی ہے۔ اذا زلزلت الارض زلزالھا و اخرجت الارض اثقالھا۔ ترجمہ:۔ قیامت میں زمین میں مکمل زلزلہ آئے گا۔ اور زمین اپنے مواد باہر اگل دے گی۔ اگر قیامت کو اسلامی نقطہ نظر سے اغماض کرتے ہوئے تسلیم نہ کیا جائے۔ تب بھی قانون فلسفہ اور سائنس کے مطابق اس کو تسلیم کرنا لازمی امر ہے۔ کیونکہ آہستہ آہستہ کمزوری تمام زمین میں پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے ایک دن ایسا ضرور ہوگا جب اس کی کمزوری عالمگیر ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عالم گیر زلزلہ آئے گا۔

(۷) قطب شمالی پر اس قدر برف ہے کہ اگر وہ کسی وجہ سے پگھل جاتے تو تمام زمین کو ڈھانپ لے۔ اور قیامت آجائے۔ قانون طبعیات کے ماہرین واقف ہیں کہ پانی میں انبساط اور انقباض کی طاقت ہے۔ پانی منقبض ہو کر برف بن جاتا ہے۔ اور برف حرارت سے سیال پانی۔ کبھی شدت حرارت سے ہوا بنکر فضائے عالم میں پھیل جاتا ہے۔ اگر قطب شمالی کا تمام برف پگھل کر پانی بن جائے تو روئے زمین کا ہر حصہ ڈوب جائے۔ یہیں سے جناب نوحؑ کے طوفان کے عالمگیر

نے کا ثبوت ملتا ہے۔ بعض ماہرین فلسفہ یہ کہتے ہیں کہ زمین کردی ہے اس
ئے یہ ناممکن ہے کہ وہ تمام پانی میں ڈوب سکے۔ لیکن جدید تحقیقات سے معلوم
وتا ہے کہ صرف قطب شمالی ہی پر اس قدر برف ہے کہ اگر وہ کسی وجہ سے پگھل کر
نی کی صورت اختیار کر لے۔ تو تمام زمین غرق ہو جائے۔ اور اگر اس کے ساتھ
حرِ منجمد جنوبی اور دیگر مقامات کے برف شریک ہو جائیں تو اس زمین سے وسیع
ظام کو ڈبو دیں۔

(۹) نظام عالم کے درہم وبرہم کرنے کے لئے منجملہ دیگر اسباب ارضی و
ماوی کے آندھیاں ہیں بعض اوقات کسی قدر تیز آندھی چلتی ہے تو مضبوط جڑوں
والے پیڑ اور مستحکم بنیاد والے مکان متزلزل ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ہوا
یں پوری طاقت کے ساتھ تموّج ہو تو مکانوں اور درختوں وغیرہ کا قائم رہنا ناممکن
ہے۔ اور ان کے باہمی تصادم سے کسی ذی روح کا بچنا محال ہو گا۔ اس لئے آندھی
ہی قیامت کے لئے کافی ہے۔

"قیامت کب ہو گی۔ اور اب تک کیوں نہیں ہوئی" اس کے جواب میں میں
یہ عرض کرتا ہوں کہ جب نوع انسانی کی تمام افراد عالم وجود میں آجائیں گی۔ اور
کوئی فرد باقی نہ رہے گی۔ تب قیامت آئے گی۔ اگر نوع انسانی کی بعض افراد
عالم وجود میں آجائیں اور بعض نہ آئیں تو قیامت آنے کی صورت میں یہ سوال پیدا
ہوتا ہے کہ بعض افراد وجود میں کیوں آئیں۔ اور بعض کیوں نہیں آئیں یہ ہی ترجیح

بلا مرجح ہے جس کو اہل فلسفہ محال کہتے ہیں۔ کیونکہ پیدا شدہ افراد کو مادہ۔ خالق
زمانہ وغیرہ سے وہی نسبت ہے جو ناپید افراد کو۔ اس لئے قیامت اس وقت تک
نہیں ہوسکتی جب تک کہ نوع انسانی کی تمام ممکن افراد ظہور پذیر نہ ہو جائیں۔ اب
تک نوع انسانی کی تمام افراد پیدا نہیں ہوئیں اس لئے قیامت بھی نہیں ہوئی۔

مرنے والوں کی روحیں اب تک بہشت میں پہنچیں یا نہیں۔ اگر نہیں پہنچیں تو اسوقت کہاں ہیں اور ان کے اعمال کا فیصلہ کب تک زیر تجویز رہے گا۔

روح اہل فلسفہ اور اسلام کے نزدیک مجرد اور بسیط ہے اور مجرد و بسیط کیلئے مکان کی قید نہیں ہوتی۔ مکان صرف ان اشیار کے لئے ضروری ہے جو مادی ہیں
جمادات۔ نباتات۔ حیوانات۔ انسان۔ بغیر مکان کے نہیں پائے جاسکتے۔ کیونکہ
وہ مادی ہیں، یا یوں کہوں کہ ان کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔ اور جن اشیار کی
طرف اشارہ حسیہ ہوسکتا ہے وہ مکان کی محتاج ہیں۔ روح نہ مادہ ہے نہ مادی۔ نہ
جسم ہے نہ عوارض جسم۔ نہ اس کی طرف انگلی سے اشارہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے
وہ اپنے وجود و بقا میں مکان کی محتاج نہیں ہوسکتی۔ اگر مجازاً روح کے لئے کوئی
جگہ معین کی جاسکتی ہے تو صرف اس قدر کہ روح کا اس جسم سے تعلق مانا جائے جو
کسی خاص جگہ محدود ہو۔ فرض کیجئے زید اس وقت مدرسہ میں ہے اس لئے اس کی روح

کا تعلق مدرسہ سے صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ روح جسم سے تعلق رکھتی ہے اور
جسم مدرسہ سے اس لئے بالواسطہ روح کا تعلق جگہ سے ہو گا۔ اس کلیہ کی بنا
پر کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جس طرح جسم مکان کے اندر ہوتا ہے۔ اسی طرح روح بھی
جسم کے واسطہ سے مکان کے اندر رہتی ہے۔ کیونکہ روح جسم کے اندر نہیں
ہوتی۔ اس کا تعلق جسم سے اس طور سے ہوتا ہے کہ اس کو نہ جسم کے اندر کہہ سکتے
ہیں اور نہ تعین کے ساتھ باہر۔ کیونکہ اگر روح کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ جسم میں
ہے یا فلاں مقام پر جسم کے باہر ہے تو وہ مادی ہو جائے گی۔ حالانکہ روح کا جسم
مادی ہونا محال ہے۔

روحیں اب تک بہشت یا دوزخ میں نہیں پہونچیں۔ کیونکہ عدالت عالیہ الٰہی
کا آخری فرمان جس پر بہشت و دوزخ کا داخلہ موقوف ہے قیامت میں جاری ہو گا
انسان حیوان اور ناطق کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لئے روح فلسفہ الٰہیات کے
مطابق اسی وقت دوزخ یا بہشت میں جا سکتی ہے جبکہ اسے پہلا جسم مل چکا ہو۔ ابھی
تک روح اور اس جسم میں افتراق ہے جس میں اس نے کار ثواب یا گناہ کئے
تھے۔ قیامت میں روح کا جسم سے وہی تعلق ہو گا جو دُنیا میں تھا۔ اس لئے بہشت و
دوزخ میں جانا اس دن پر منحصر ہے جبکہ انسان دُنیا کی طرح پھر مجموعۂ حیوان و
ناطق کہلائے گا۔

اگر روحیں بہشت میں نہیں پہنچیں تو اس وقت کہاں رہتی ہیں۔ اِس کے

متعلق میں بطور تمہید عرض کر چکا ہوں کہ روح جب تک اس کے ساتھ جسم نہ ہو عام اس سے کہ وہ لطیف ہو یا جسم کثیف جگہ کی محتاج نہیں۔

وادی السلام اور وادیٔ برہوت کی دو تفسیریں

اسی لئے غالباً اسلام نے یہ بیان کیا ہے۔ کہ نیکوں کی روحیں وادی السلام یعنی سلامتی کے جنگل میں رہتی ہیں۔ اور گنہگاروں کی روحیں وادی برہوت یعنی عذاب کے مقام میں۔ وادی السلام اور وادیٔ برہوت بالکل ایسے ہی لفظ ہیں جیسے دست شفقت۔ سایۂ عاطفت۔ کمر ہمت۔ ظاہر ہے کہ شفقت کے ہاتھ۔ مہربانی کا سایہ۔ ہمت کی کمر نہیں ہوتی۔ بولنے والے کا مقصد صرف شفقت۔ مہربانی۔ ہمت ہوتا ہے۔ زینت کلام یا محاورہ کی وجہ سے ناقابل دید چیزوں کے ساتھ دیدہ چیزوں کو منضم کر دیتے ہیں۔ تاکہ مخاطب اچھی طرح سمجھ جائے مثلاً شفقت ایسی چیز نہیں جس کو آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہاتھ ملادے جس کو آنکھ روزمرہ دیکھتی ہے۔ اس لئے مخاطب فوراً سمجھ جاتا ہے کیونکہ انسان معقول کی بہ نسبت محسوس کو زیادہ سمجھتا ہے۔ یا صحن وجود۔ راہ عدم۔ ظاہر ہے کہ وجود کوئی مکان نہیں ہے جس کے لئے صحن ہو۔ عدم کوئی جنگل یا شہر نہیں ہے جس کے لئے راہ ہو۔ پھر کیوں اس طرح استعمال کئے جاتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ وجود و عدم غیر محسوس ہونے کی وجہ سے جلد سمجھ میں نہیں آتے۔ صحن اور راہ محسوس ہیں اس لئے متکلم صحن اور راہ کو وجود و عدم کے ساتھ ملاتا ہے۔ تاکہ کلام

فصیح ہو اور مخاطب آسانی سے سمجھے۔ اسی طرح سلامتی اور عذاب کسی جنگل کا نام
نہیں ہے۔ صرف اس لئے لفظ وادی کا اضافہ ہوا کہ سلامتی اور عذاب غیر محسوس تھے
جو شکل میں سمجھ میں آتے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وادی ایک بدیہی اور محسوس چیز
ہے لہذا غیر محسوس کے ساتھ محسوس کو بڑھادیا تاکہ مخاطب کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔
اب اسلام کے مقولہ کا صاف مفہوم یہ ہوا کہ روح سلامتی اور عذاب میں ہے میری
یہ عرضداشت صرف ان فلاسفران اسلام کی بنا پر تھی جو روح و جسم کے درمیان
بغیر کسی واسطہ کے رابطہ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن وہ اسلامی فلسفی جو روح و جسم
کے رابطہ میں نفس کو واسطہ جانتے ہیں۔ روح کیلئے جگہ تجویز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ
ان کے نظریہ کی بنا پر روح مجرد محض ہے اور جسم کثافت محض۔ اس لئے دونوں
میں ربط دینے کے لئے کسی ایسے واسطہ کی ضرورت ہے جو نہ محض لطیف ہو
اور نہ کثیف ہو۔ بلکہ بین بین ہو۔ تاکہ اس کا دونوں سے تعلق ہو۔ اس کو نفس یا
عالم مثال۔ یا جسم مثالی کہتے ہیں۔ خواب میں روح اسی جسم مثالی کے ساتھ نظر
آتی ہے۔ فرض کیجیئے زید خواب میں بکر کو دیکھتا ہے۔ اگر خواب میں بکر کی صرف
روح آتی تو اس کے آنکھ۔ ناک۔ ہاتھ۔ پیر نہیں۔ اس لئے زید اس کو کیونکر
دیکھتا۔ حالانکہ زید بلا کسی دقت کے بکر کو دیکھتا ہے۔ پہچانتا ہے۔ یہ بھی نہیں
کہا جاسکتا کہ زید کے خواب میں بکر کا بستر استراحت سے پر سویا ہوا جسم چلا
آیا۔ کیونکہ یہ تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے۔ بعض اوقات انسان خواب میں کسی شخص کو

اس عمارت میں دیکھتا ہے جس میں منتقل ہونے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ اور اگر بفرض
محال قابلیت انتقال ہو تو کروڑوں میل کا فاصلہ اور پھر خواب میں دیکھنے وا
بھی کبھی کبھی ایسا غریب کہ اس کو دو دو دن کے فاقہ ہوں پھر وہ کس طرح کروڑ
کوس کی منتقل نہ ہونیوالی عمارت اور اس شخص کو خواب کے چند سکنڈوں میں منگا سکتا ہے
اس لیئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ زید بکر کی روح کو جسم مثالی میں دیکھتا ہے جسم مثالی
بالکل جسم مادی ہے۔ اعضا اور جوارح دونوں کے ایک سے ہیں۔ فرق یہ ہے جسم
مثالی میں مادہ کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اور جسم مادی میں ظاہر ہے کہ جزء اعظم مادہ ہوتا
بہر حال اس نظریہ کی بنا پر روح جسم مادی چھوڑنے کے باوجود جسم مثالی سے علیحد
نہیں ہوتی۔ اگرچہ جسم مثالی جسم مادی کی طرح کثیف نہیں ہوتا تاہم اس کو وہ اعلیٰ
درجہ کا تجرد بھی حاصل نہیں ہے جو روح کے لیئے ہے۔ اس لیئے ممکن ہے کہ اس
کا کسی خاص جگہ سے تعلق فرض کیا جائے۔ اسی بنا پر وادیٔ السلام اور وادی بر
خاص خاص مقامات کے نام رکھے جا سکتے ہیں۔ رہا یہ امر کہ وادی السلام نجف اشرف
کو کہا جائے۔ اس کا تعلق عقیدہ اور منقولات سے ہے۔ لیکن عقل اس قد
ضرور تسلیم کرتی ہے کہ وادیٔ السلام وہ مقام ہونا چاہیئے جو روحانیت کا م
بن چکا ہو۔ ابھی یہ سوال باقی رہتا ہے۔ "اگر روحیں بہشت میں نہیں پہنچیں
ان کے اعمال کا فیصلہ کب تک زیر تجویز رہے گا؟" یہ ایک سفسطہ ہے دنیا
دنیا کی طرح عدالت نہیں ہے کہ برسوں مقدمہ لڑتا رہے۔ پھر بھی صحیح فیصلہ نہیں

ہوتا۔ عدالت عالیہ الٰہی میں مرنے کے بعد فوری فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔ مرنے کے بعد جو فوری فیصلہ ہوتا ہے وہ اجمالی ہے اور جو قیامت میں فیصلہ ہوگا وہ تفصیلی ہے۔ ان دونوں فیصلوں کے درمیان کا عرصہ اس لئے ہے کہ نوع انسانی کی تمام افراد عالم وجود میں آ جائیں۔ اور جو روحیں زیادہ سزا کی مستحق نہیں ہیں۔ وہ اس عارضی جیل میں جس کا نام عالم برزخ ہے اپنے گناہوں کی سزا کاٹ کر تفصیلی فیصلہ تک بری ہو جائیں۔ اور جو روحیں زیادہ عذاب کی مستحق ہیں اُن کے عذاب میں اس عارضی مدت کی سزا کی وجہ سے تخفیف ہو جائے۔

روح کیا چیز ہے اور اس کا خاصہ کیا ہے اور ان روحوں کے علاوہ جو اب تک انسانی پیکر میں پہنچ چکی ہیں کچھ روحیں باقی ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو کہاں رہتی ہیں۔

فلاسفران عالم روح کے متعلق مختلف الخیال ہیں۔ بعض روح کو صرف خون کا دوران کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک روح بخارات لطیفہ کا نام ہے امریکہ میں ایک ڈاکٹر نے روح کی تحقیق کی۔ اس نے ایک بیمار کو جو نزع کے عالم میں تھا اس کے ورثہ سے خرید لیا۔ اور ایک شیشہ کے مکان میں اس کو لٹا دیا۔ یہ مکان چاروں طرف سے بند تھا۔ بیرونی ہوا کسی طرح اندر جا سکتی تھی۔ ڈاکٹر خوردبین لگائے روح کے نکلنے کا منتظر تھا۔ ڈاکٹر کا بیان ہے کہ بیمار پر جب آثار موت نمایاں ہوئے تو اس کے مونہہ سے ایک بنفشجی رنگ کا دھواں نکلا۔ اور چھت کی طرف کو اڑا۔ آخر میں وہ دھواں اسی انسان کی شکل بنا اور اپنے پیکر خاکی کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

دھواں ہو گیا۔ اور اوپر کی طرف اُڑا۔ اس سے اس مکان کے ٹکڑے ہو گئے۔

امریکن ڈاکٹر کے خیال میں روح اسی نفسی دھوئیں کا نام ہے بعض اہل فلسفہ روح کو ریاح سے مشتق جانتے ہیں۔ اس لئے ان کے خیال میں وہ ایک قسم کی ہوا ہے

اکثر محققین ارسطو، جالینوس، افلاطون، وغیرہ اور اسلامی فلسفیوں کے نزدیک روح جوہر مجرد ہے۔ جو بدن سے تدبیر و تصرف کا تعلق رکھتی ہے اسی کو نفس ناطقہ کہتے ہیں۔

محققین اہل فلسفہ کے نزدیک روح جسم سے پہلے پیدا نہیں ہوتی۔ جب جسم میں استعداد ہوتی ہے تو اسی کے مطابق قدرت کی طرف سے اس پر روح کا فیضان ہوتا ہے۔ روح کے فیضان کی شرط استعداد جسم ہے۔ اسی وجہ سے موالید ثلثہ ارواح کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ جمادات میں سب سے کم استعداد ہے اس لئے اس سے کسی قسم کی روح کا تعلق نہیں ہے۔ نباتات، جمادات کی بہ نسبت زیادہ استعداد رکھتے ہیں۔ اس لئے ان پر روح نمو کا فیضان ہوا۔ حیوانات میں نباتات سے زیادہ استعداد ہے اس لئے ان پر قدرت کی طرف سے روح حیوانی کا فیضان ہوا۔ انسان میں حیوانات کی بہ نسبت زیادہ استعداد ہے۔ اس لئے اس پر قدرت کی طرف سے نفس ناطقہ کا فیضان ہوا۔ بہر حال روح کی پیدائش استعداد جسم پر موقوف ہے۔ اس لئے اس

کے وجود سے قبل نہیں پائی جا سکتی۔ اس نظریہ کی بنا پر جسقدر اجسام ہیں اتنی ہی روحیں ہیں۔ جب ارواح اجسام سے زیادہ نہیں ہیں تو یہ سوال خود بخود برطرف ہو جاتا ہے۔ "بقیہ روحیں کہاں رہتی ہیں۔" کیونکہ بچنے اور رہنے کا سوال تو اس وقت ہے جبکہ وہ موجود ہوں۔ حالانکہ وہ اجسام سے قبل نہیں ہوتیں۔ البتہ اُن حکماء کی رائے کی بناء پر جو ارواح کے وجود کو جسم کے مخلوق ہونے سے قبل تسلیم کرتے ہیں۔ روح کا تعلق عالم قدس سے ہے جو روحانیت کا مرکز ہے۔ روح کا خاصہ کیا ہے اس کو ہم سولھویں باب میں بیان کریں گے۔
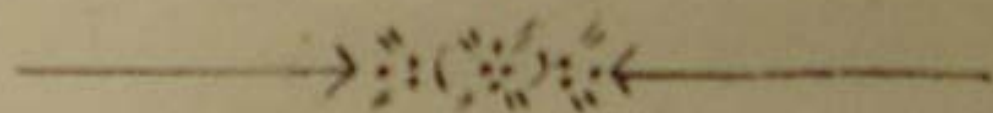
باب ۱۶

کیا روحیں اب بھی پیدا کی جائیں گی۔ اور روح کا میلان نیکی کی طرف ہوتا ہے یا بدی کی طرف یا اس کو جسم نیک و بد بنا دیتا ہے۔ جب خدا نیکی کو پسند کرتا ہے۔ اور روح کو نیک بناتا ہے تو وہ اس کی مرضی کے خلاف کیوں بُرے افعال کرتی ہے

گزشتہ باب میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ روح کا وجود استعداد جسم پر موقوف ہے اس لئے جب تک اجسام میں استعداد رہے گی قدرت کی طرف سے روحوں کا فیضان ہوتا رہے گا۔ روح کا خاصہ کیا ہے اور اس کا طبعی میلان نیکی کی طرف ہے یا بدی کی طرف۔ اس کے متعلق حکمار اور اہل فلسفہ مختلف الخیال ہیں۔ بعض حکمار کے نزدیک روح نیک پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بدوں کی صحبت یا ضرورت اس کو بد بنا دیتی ہے۔ بعض فلسفیوں کے

نزدیک روح بالطبع شریر پیدا ہوتی ہے۔ اس کا میلان فطرتاً گناہ ک
طرف ہوتا ہے۔ لیکن نیکوں کی صحبت اس کو نیک بنا دیتی ہے۔ محققین ا
اور دیگر اہل فلسفہ کی یہ رائے ہے کہ روح نہ نیک پیدا ہوتی ہے نہ بد۔ بل
قدرت نے اس میں نیکی و بدی کی استعداد رکھی ہے۔ ان کے خیال میں ر
ایک سادہ ورق ہے جس پر ہر قسم کے نقش و نگار بن سکتے ہیں۔ جالینوس فا
کے نزدیک بعض روحیں فطرتاً نیک پیدا ہوتی ہیں اور بعض شریر اور بعض نہ
نہ بد۔ ان حکماء کی رائے کی بنا پر جو اس امر کے قائل ہیں کہ روح فطرتاً ن
پیدا ہوتی ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نیکی کو پسند کرتا
اس لئے اس کو نیک بناتا ہے تو وہ اس کی مرضی کے خلاف کیوں بُرے
افعال کرتی ہے؟ اس کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ خدا نے کسی
اچھے یا بُرے افعال کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ اس نے روح کو خود مختار بنا کر
ہے، اس کے بعد اس کے لئے نامناسب ہے کہ وہ روح کو مجبور کرے ا
کے افعال کا تعلق اس کے ارادہ سے ہے۔ یہ روزمرّہ کا تجربہ ہے کہ ہم جب ک
اچھا فعل کرنا چاہتے ہیں۔ تو غیبی طاقت ہمیں اس کے کرنے یا نہ کرنے
مجبور نہیں کرتی۔ آج تک کسی عبادت گزار سے یہ نہیں سُنا گیا کہ وہ عباد
کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور کیا گیا ہے۔ اسی طرح کسی چور سے یہ نہ
سُنا گیا کہ وہ چوری کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور تھا۔ عبادت گ

اور چور دونوں اپنے افعال میں مختار ہیں۔ جب روح کو مختار بنایا گیا تو ضروری نہیں کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق ہی افعال کرے۔ اگرچہ خدا اس کے مجبور کرنے پر قادر ہے لیکن اس کی شان الوہیت کے خلاف ہے کہ وہ جس کو اپنی مشیت کے مطابق مختار بنائے اس کو مجبور کرے۔ اگر وہ اپنی بااختیار مخلوق کو مجبور کرے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اختیارات سپرد کرتے وقت وہ آنے والے واقعات سے بے خبر تھا، تجربہ کرنے کے بعد اس کو اپنی رائے میں تبدیلی کرنی پڑی۔ حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ تجربہ کا محتاج نہیں ہے۔ اسی لئے اس کے قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ روح کے اچھے یا بُرے فعل کرنے میں جسم کے تعلق کو کوئی دخل نہیں ہے۔ جسم نہ اس کو نیکی سکھاتا ہے نہ بدی۔ وہ خود اس کا تابع ہوتا ہے جسم کا کوئی عضو اچھی یا بُری حرکت اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ روح کا حکم نہ ہو۔ ہاں بعض افعال و اخلاق مزاج کے تابع ہوتے ہیں۔ مثلاً غصہ اُس شخص کو زیادہ آئے گا جو صفراوی مزاج رکھتا ہو۔ شرم اس کو زیادہ معلوم ہوگی جس کے مزاج میں بلغم ہو۔ تاہم اس سے روح کے اختیارات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ صفراویت کے باوجود تحمل کرنے پر قادر ہے۔ بلغمیت کے ہوتے ہوئے شرمناک افعال کر سکتی ہے۔ اس لئے ہر صورت میں اس کے اختیارات کا باقی رہنا ضروری ہے۔

باب ۱۷

عقل روح کے ساتھ رہتی ہے یا روح کے جسم میں داخل ہونے کے بعد اس کو راستہ بتانے آتی ہے
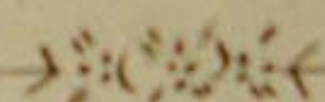
اس موضوع پر "عقل روح کے ساتھ رہتی ہے یا بعد میں راستہ بتانے آتی ہے" بحث کرنے سے قبل ہمیں یہ بتانا ضروری ہے کہ عقل کس کو کہتے ہیں اور اس کا تعلق روح سے کیا ہے۔ روح کے اندر دو قوتیں ہیں۔ قوت عالمہ۔ قوت عاملہ۔ روح قوت عالمہ کے ذریعے جزئیات کو دیکھتی ہے۔ سُنتی ہے۔ چکھتی ہے سونگھتی ہے۔ اس کے علاوہ کلیات کا ادراک بھی کرتی ہے۔ اگر قوت عالمہ نہ ہو تو روح دوست کو دشمن سے اور عزیز کو غیر سے ممتاز نہیں کر سکتی۔ اس کے علم کا دارمدار اسی قوت کی بقا پر ہے۔ قوت عالمہ کا تعلق جزئیات اور کلیات سے یکساں ہے کیونکہ جس طرح روح اس قوت کے ذریعے زید کو پہچانتی ہے۔ اس کی گفتگو سُنتی ہے۔ ماں باپ کا امتیاز کرتی ہے۔ اسی طرح قوانین کلیہ کو مثلاً ہر انسان صاحب عقل ہے۔ ہر حیوان چلنے کی قوت رکھتا ہے۔ ہر جسم نامی میں قوت نامیہ ہے۔ جانتی ہے

قوت عاملہ سے روح ان تمام افعال کو کرتی ہے جو اس کے لئے ممکن الوجود ہیں اگر قوت عاملہ نہ ہو تو انسان نہ روزی کما سکتا ہے نہ صنعت و حرفت کر سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے نہ پی سکتا ہے۔ غرض کوئی حرکت ایسی نہیں جو بغیر قوت عاملہ کے ظہور پذیر ہو۔ میری اس مختصر تمہید کا نتیجہ یہ ہے کہ عقل روح سے کوئی علیحدہ شے نہیں ہے۔ بلکہ اسی کی قوت عالمہ کا نام عقل ہے۔ اس لئے روح کے ساتھ قوت عاقلہ کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ روح وجود میں آئے اور اس کی قوت عالمہ موجود نہ ہو۔ یہ جاننے کے بعد کہ عقل روح کی قوت علمیہ کا نام ہے۔ کوئی سمجھدار آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ عقل روح کے جسم میں داخل ہونے کے بعد اس کو راستہ بتانے کے لئے آتی ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ روح جسم میں داخل ہوتی ہے۔ کیونکہ مادی شے میں دو چیزیں داخل ہو سکتی ہیں۔

(۱) اعراض جیسے سفیدی، سُرخی، سیاہی۔

(۲) مادیات جیسے برتن میں پانی۔ گلاس میں شربت، خزانہ میں روپیہ صندوق میں زیورات۔

لیکن یہ ناممکن ہے کہ غیر مادی یعنی مجرد مادی شے میں داخل ہو۔ اگر مجرد مادی محل میں داخل ہوگا تو قانون فلسفہ کے مطابق اس کا تجزیہ و تقسیم ممکن ہوگی حالانکہ مجردات کا تجزیہ و تقسیم ناممکن ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روح جسم میں داخل ہوتی ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ روح کا جسم سے تعلق ہے

عقل کے چار مرتبہ ہیں۔ (۱) عقل ہیولانی۔ (۲) عقل بالملکہ (۳) عقل مستفاد
(۴) عقل بالفعل۔ عقل ہیولانی جس میں بدیہات و نظریات کے نقش کی
صلاحیت ہو۔ لیکن بالفعل انسان میں نہ بدیہات پائے جاتے ہوں نہ نظریات۔
عقل بالملکہ۔ اس مرتبہ میں انسان بدیہات سے واقف ہوتا ہے۔ عقل بالفعل
اس مرتبہ میں انسان بدیہات سے نظریات کو اخذ کرتا ہے۔ عقل بالمستفاد اس مرتبہ
میں انسان کے ذہن میں نظریات بدیہات کے مثل حاضر رہتے ہیں۔ یہ ہی
وہ درجہ ہے جس پر پہنچکر انسان کامل کہلاتا ہے۔ عقل کسی مرتبہ میں ہو لیکن روح
سے جدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ علیحدہ سے روح کے ساتھ منضم نہیں ہوئی جس طرح
چکنائی گھی کی حقیقت میں داخل ہے۔ کیونکہ وہ خارج سے لاکر گھی میں نہیں ملائی جاتی
اسی طرح عقل روح کی حقیقت میں داخل ہے۔ اس لئے روح کے ساتھ عقل کا
ہونا ضروری ہے۔

باب ۱۸

خدا نے اب تک شیطان کو اس کے افعال بد پر سزا کیوں نہیں دی تاکہ انسان گناہ سے بچ جاتا

سزا دو قسم کی ہوتی ہے۔ (۱) معمولی سزا جس کا تعلق انسان کی زیست سے ہوتا ہے۔ یعنی ملزم کو اس قدر سزا دی جائے کہ اس کی موت واقع نہ ہو۔

(۲) وہ سزا جس سے جسم و روح کے تعلقات منقطع ہو جائیں۔ شیطان کے متعلق میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ فرد واحد کا نام نہیں ہے بلکہ ہر گنہگار انسان کو شیطان کہتے ہیں۔ اس لئے اگر شیطان کے لئے سزائے موت تجویز کی جائے تو دُنیا کے تمام انسانوں کو فنا کرنا پڑے گا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام نظام عالم درہم و برہم ہو جائے گا۔ اسی کا نام قیامت ہے۔ اس کو اُس وقت ہونا چاہئے۔ جب مادہ سے استعداد فنا ہو جائے اور پیدا ہونے والی کوئی فرد باقی نہ رہے اور اگر آج ہی خداوند عالم انسان کی بعض افراد کے لئے سزائے موت تجویز کرے۔ جس سے پیدا ہونے والی افراد مستثنیٰ رہیں تو ترجیح بلا مرجح کا سوال ہوتا ہے۔ کیونکہ

اس امر کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ زمانہ ماضی کے پیدا ہونیوالے سزائے موت
میں مبتلا ہوں۔ اور مستقبل کے خوش نصیب آزاد رہیں۔ اس لئے تمام عالم کو سزائے
موت صرف اس وقت ہو گی جب پیدا ہونے والی افراد باقی نہ رہیں۔ ہاں پہلی
قسم کی سزا ہر وقت ممکن ہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے ہر انسان کو اس کے
گناہ پر سزا دی جائے یا بعض کو سزا دی جائے اور دوسروں کو دکھایا جائے تاکہ
وہ ان سے عبرت حاصل کریں اور خائف ہو کر گناہ کی طرف متوجہ نہ ہوں؟ ہر اس
ادارہ کا جس میں خدمت گزار اور کام کرنے والے سرکش ہوتے ہیں قانون ہے کہ
اس کا افسر اعلیٰ اُن کے لئے سزا تجویز کرے۔ لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ تمام
ادارہ والوں کو جو سرکش ہیں یک لخت سزا دے۔ فرض کیجئے ایک کالج میں ایک ہزار
طلبہ تعلیم پاتے ہیں اور اتفاقاً تمام یا اکثر طلبہ سرکش اور متمرد یا بدچلن ہیں تو افسر اعلیٰ
ان میں بڑے بڑے فتنہ پرداز یا بدچلنوں کو منتخب کرے گا جو دو چار سے زیادہ
ہوں گے۔ اور ان کے لئے سخت ترین سزا تجویز کرے گا۔ تاکہ دوسروں کو عبرت
دانشمند تجربہ کار پرنسپل کبھی اس امر کو گوارا نہ کرے گا کہ کالج کے تمام طلبہ کو عذ
میں مبتلا کر دے۔ پرنسپل کبھی بعض سرکشوں کو مہلت بھی دے گا۔ تاکہ ان کو اپنی
ناجائز حرکات پر غور اور صحیح و غلط عمل میں فیصلہ کا موقع ملے۔ یہ ہی حالت قدرت
کی رہی۔ دُنیا کے سرکشوں اور گنہگاروں میں بڑے بڑے مفسدوں کو چھانٹا۔ بعض
کو بالاعلان سزا دے کر دوسروں کے لئے عبرت بنایا۔ جیسے فرعون، ہامان، نمر

قوم نوح قوم لوط، قوم صالح اور بعض کو مہلت دی تاکہ اپنے افعال میں صحیح فیصلہ کریں۔ اور صحیح فیصلہ نہ کرنے کی صورت میں عذاب ابدی کے لئے تیار رہیں جیسے ابوجہل، ابولہب وغیرہ۔

(۲) دُنیا میں ہر فعل کی فوری سزا و جزا کو عقل تجویز نہیں کرتی۔ کیونکہ حقیقی فعل جس پر سزا و جزا کے آثار مرتب ہوں وہ ہونا چاہئے جس میں خوف و طمع کا شائبہ نہ ہو۔ اب اگر کسی فعل کی فوری سزا یا جزا مل جائے۔ تو آئندہ فعل اسی سزا یا جزا کا نتیجہ ہوگا۔ فرض کیجئے زید نے ایک غریب کی امداد کی۔ فوراً اس کو جزا مل گئی۔ تو اس کا دوبارہ کسی غریب کی امداد کرنا اسی طمع کی وجہ سے ہوگا۔ اسی طرح زید نے کسی مظلوم کو ستایا اور فوراً اس کو سزا دیدی گئی۔ تو اس کا ظلم نہ کرنا اسی خوف سے ہوگا۔ کیونکہ یہ فطری امر ہے کہ انسان گزشتہ سزا و جزا کو آنے والے افعال میں نظر انداز نہیں کرتا۔ اب اگر زید کو اس کے افعال پر جزا و سزا نہ دی جائے بلکہ اچھے اور بُرے رویہ کو تعلیم کر کے اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اس کے اعمال کا تعلق خوف و طمع کے بجائے اس کی نیت سے ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ جس کے اعمال کا تعلق خوف و طمع سے ہوگا وہ مدح و ذم یا جزا و سزا کا مستحق نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر زید سزا کے خوف سے شراب نہ پئے۔ زنا نہ کرے۔ تو کوئی منصف مزاج انسان اس کی مدح نہ کرے گا۔ اور نہ اس کو مستحق ثواب سمجھے گا۔ اسی طرح اگر زید طمع جزا سے اپاہجوں کی امداد کرے۔ فقیروں کو کھانے کھلائے

توکوئی عقلمند آدمی اس کی تعریف نہ کرے گا۔ اس لئے دُنیا میں جو انسان کے لئے آزادی سے اعمال کرنے کا مقام ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ فوری سزا وجزا دیکر اس کے آئندہ اعمال کا پوزیشن صاف نہ کیا جائے۔ میں دوسرے الفاظ میں یوں کہتا ہوں کہ دُنیا میں فوری جزا وسزا دینا انسان کے افعال کی خلوصیت کو برباد کرنا ہے۔

(۳) گناہ اطاعت کی ضد ہے۔ کیونکہ گناہ پر سزا کے آثار مرتب ہوتے ہیں۔ اور اطاعت پر جزا کے آثار۔ جب عقل اور تجربہ کی بنا پر دُنیا میں ہر نیکی کرنے والے انسان کو رضا کا پروانہ نہیں ملتا تو ہر گناہ کرنے والے کو بھی سزا نہیں ملسکتی دُنیا کبھی ایسے عبادت گزاروں سے خالی نہیں رہی جو ہمیشہ قدرت کی بے نیاز درگاہ میں سر بسجود ہوں۔ خدا جانے کتنے فقیر پہاڑوں کے دامنوں سے سر اطاعت ٹکرا کے اس عالم فانی کو خیر باد کہہ گئے۔ کتنے رشی وولی جنگلوں اور خانقاہوں میں وقف عبادت رہے۔ لیکن دم واپسیں تک اپنی کارکردگی یعنی اطاعت زہد و تقویٰ کے نتیجے سے مطمئن نہوئے۔ اگر نیکی کا فوری بدلہ مل جاتا تو وہ یقیناً قدرت کی رضا کا پروانہ دیکھ کر مطمئن ہوجاتے۔ جب عبادت گزاروں کو جزا نہیں دی گئی توعقل اس امر کو ناممکن جانتی ہے کہ گنہگاروں کو فوری سزا دی جائے۔ اس لئے جو آنے والا وقت عبادت گزاروں کی جزا کے لئے ہوگا۔ وہی گنہگاروں کی سزا کے لئے ہونا چاہیئے۔

(۴) گزشتہ فعل کی سزا اور آئندہ فعل میں زمانہ کا تفاوت ہونا ضروری ہے
یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص نماز پڑھے اور اسی وقت گزشتہ فعل کی اس کو سزا
دی جائے۔ اگر ایسا ہو گا تو نماز گزار کی نماز میں خلل کی ذمہ داری سزا دینے
والے کی طرف عائد ہو گی۔ اس لئے وہ اس عبادت کی کوتاہی پر اس کو سزا نہ دے
سکے گا۔ اگر کوئی معلم کسی طالب علم کو سزا دیتا ہے تو پہلے اس کا سبق بند کر دیتا
ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک طرف اس طالب علم کو سزا دی جائے اور دوسری
طرف اس تکلیف کے ساتھ کتاب کے سبق یاد کرنے کا حکم ہو۔ اگر ایسا کیا جائے
تو دنیا کے عقلمند سزا دینے والے کو ظالم کہیں گے۔ اسی لئے دنیا کی تمام عدالتوں
کا یہ دستور العمل رہا ہے کہ وہ پہلے مجرم کو اس کے محکمہ سے معطل کراتی ہیں۔ کیونکہ
یہ ناممکن ہے کہ مجرم ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ پیروں میں بیڑیاں پہن کر دفتروں کا کام
انجام دے۔ مجھے اس امر میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ اگر گزشتہ فعل کی سزا اور
آنے والے فعل کا وقت واحد ہو تو کبھی انسان گناہ سے نجات حاصل نہیں کر سکتا
کیونکہ سزا کے وقت وہ جس فعل میں مشغول ہے اس کو صحیح طور سے انجام نہیں
دے سکتا۔ اس لئے وہ اس پر بھی سزا کا مستحق ہو گا۔ اس سزا کے وقت بھی دوسرے
فعل سے اس کا تعلق ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اس فعل کی سزا اس کو اس وقت
ملے گی جو تیسرے فعل کا وقت ہو گا۔ سزا پانے کی وجہ سے یہ تیسرا فعل بھی ناقص
ہو گا۔ اس لئے اس کو چوتھے فعل کے وقت میں سزا ملے گی۔ گزشتہ سزا پانے کی

وجہ سے مجرم اس چوتھے فعل کو بھی ناقص انجام دے گا۔ دُنیا میں کوئی منٹ یا سیکنڈ ایسا نہیں جس کا تعلق انسان کے افعال سے نہ ہو۔ اس لئے فوری سزا کی بنا پر اس مجبوری کوتاہی کا سلسلہ برابر رہے گا۔ اس لئے انسان کبھی اپنے گناہوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اور نجات حاصل نہ کرنے کا ذمہ دار سزا دہندہ ہو گا۔ کیونکہ اگر وہ گزشتہ فعل کی سزا اور آئندہ فعل میں کچھ مدت کی مہلت دیتا تو انسان اپنے افعال میں خود مختار سمجھا جاتا۔ اس لئے وہ اپنے ان افعال میں جن کو اس نے آزادی سے کیا ہے۔ خود ذمہ دار ہوتا۔ اب یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ خدا نے اب تک شیطان کو سزا کیوں نہیں دی۔ کیونکہ دُنیا میدان عمل ہے۔ اگر وہ اس عالم میں سزا دیتا تو گزشتہ فعل کی سزا اور آئندہ عمل کا وقت ایک ہونے کی وجہ سے شیطان کے ناقص اعمال کا خود ذمہ دار ہو جاتا۔ اس لئے وہ ظالم کہلاتا۔ میرے بیان کا نتیجہ یہ ہے کہ عقل کے نزدیک ہر گنہگار کی سزا کا وقت وہ ہونا چاہیے جس سے اس کے اعمال کا تعلق منقطع ہو۔ اور یہ امر اس دُنیا میں ناممکن ہے کیونکہ اس کی ہر ساعت اعمال سے وابستہ ہے۔ اِس لئے دوسرے عالم میں جس میں اعمال کا تعلق نہ ہو گا۔ سزا اور جزا کا دینا ضروری ہے۔

باب ١٩

خدا نے لفظ کُن سے عالم کو کیونکر پیدا کیا۔ اگر اس سے لفظ صادر ہو سکتا ہے تو وہ عام انسانوں کی طرح ہے۔ اِس لئے انسان کی طرح اس کے لئے حدوث وفنا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جب خدا نے کُن کہا تو سُننے والا کون تھا۔ اگر سُننے والا کوئی نہیں تھا تو کُن کا خطاب کس سے ہوا۔ خالی مکان میں بولنے والے اِنسان کو بے وقوف کہا جاتا ہے۔ اس لئے خدا کو بھی بیوقوف کہنا چاہیئے کہ بے مخاطب خطاب کر رہا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ خدا کے آلات مادی یعنی زبان وغیرہ نہیں ہیں۔ اِس لئے لفظ کُن نہیں کہہ سکتا۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اس کے زبان فرض کی جائے تو انسان کی طرح اس کو حادث وفانی ماننا ہوگا۔ کیونکہ جس شے کی ترکیب اجزا سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے حدوث وفنا ضروری ہیں۔ لفظ کا

نکلنا حسب ذیل اصول کا محتاج ہے۔

زبان یا اور کوئی جزِ مادی ہو' اس کی حرکت' ہوا کا تموج۔ اگر کسی کے زبان نہ ہو یا زبان ہو اُس میں حرکت نہ ہو۔ یا حرکت ہو لیکن ہوا میں تموج نہ ہو تو لفظ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا سے لفظ صادر ہو تو وہ جزِ مادی' اس کی حرکت' اور ہوا کے تموج کا محتاج ہو گا۔ حالانکہ ذات احدیت احتیاج سے مبرّا ہے۔ اس لئے اس کے لئے یہ کہنا ناممکن ہے کہ اس نے لفظ کُن کہا۔

خالی مکان میں مخاطبہ کرنے والے کو بے وقوف کہتے ہیں۔ لیکن جب ذات احدیت سے کُن صادر ہوا تو اس کو اس کلیہ کے ماتحت نہیں لا سکتے۔ کیونکہ خطاب ظاہری کے لئے مخاطب ظاہری کا ہونا ضروری ہے۔ اور خطاب باطنی کے لئے مخاطب باطنی کا ہونا لازم ہے۔ ذات احدیت کا خطاب باطنی تھا۔ اس لئے وہاں مخاطب باطنی کا وجود ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس کے خطاب کے معنی یہ ہیں کہ اس کے علم میں پیدائش عالم کا ارادہ گزرا جس مشیت میں خطاب تھا اسی مشیت میں مخاطب بھی موجود تھا۔ اس لئے اس کا خطاب صحیح ہوا۔ خدا کا خطاب عام انسانوں کی طرح نہیں ہے۔ جو لفظ یا اشارہ پر موقوف ہو۔ وہ نہ لفظ کا محتاج ہے نہ اشارہ کا۔ پھر کیونکر خطاب کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح روح اعضاء سے خطاب کرتی ہے۔ دُنیا میں کوئی عقلمند ایسا نہیں جو روح کو اقلیم بدن کا حاکم تسلیم نہ کرتا ہو۔ حقیقتاً جسم انسانی کا بست وکشاد اسی خاموش حاکم کے سپرد ہے۔ اسی حاکم کے قطع تعلق پر عُمر بھر کی

رشتہ داریوں اور دوستانوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی فلسفی منکر نہیں کہ جس طرح ریل اور موٹر کی مشینری چلانے کے لئے ڈرائیور کی ضرورت ہے اسی طرح بدن کی مشینری چلانے کے لئے روح کا ہونا لازم ہے۔ اسی لئے اہل فلسفہ کا اتفاق ہے کہ جسم کی حرکت وسکون اور اس کا علم وشعور تمام تر روح پر موقوف ہے۔ زبان بولتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے۔ ہاتھ اٹھتا ہے۔ قدم پڑتا ہے۔ قوت متخیلہ سوچتی ہے۔ مصورہ تصویر کشی کرتی ہے۔ لیکن یہ سب اسی روح کی بدولت جو اقلیم بدن کی حاکم کہلاتی ہے۔ روح کے احکام برابر نافذ ہوتے رہتے ہیں۔ اور تمام اعضا تعمیل کرتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی آپ نے روح کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ آنکھ تو دیکھ۔ زبان تو بول۔ ہاتھ تو اُٹھ۔ قدم تو چل۔ متخیلہ تو سوچ۔ مصورہ تو تصویر کشی کر۔ یقیناً آپ نفی میں جواب دیں گے۔ پھر یہ تمام اعضا کیونکر روح کی آواز سُنتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ادھر روح کی مشیت میں گزرا اُدھر اعضاء نے تعمیل کی۔ روح دیکھنے کا ارادہ کرتی ہے آنکھیں فوراً اس کی تعمیل کرتی ہیں۔ روح بولنے کا ارادہ کرتی ہے فوراً زبان اس کو بجالاتی ہے۔ روح کے ارادے اور اعضار کے عمل کے درمیان ایک پلک زدن کی بھی تاخیر نہیں ہوتی۔ اسی طرح قدرت کی مشیت میں گزرا کہ ہوجا فوراً مخلوق ہوگیا۔ آپ کا دوست آپ کو دعوت دیتا ہے۔ آپ اس کے یہاں جاتے ہیں۔ راہ میں کسی منزل پر قیام کرتے ہیں کسی پر قیام نہیں کرتے۔ دوست کے مکان پر پہنچکر آپ ہاتھ دھوتے ہیں کھانا کھاتے

ہیں۔ پانی پیتے ہیں۔ گھر واپس آتے ہیں۔ کیا اس موقع پر میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کی روح نے آپ سے یہ کہا تھا کہ دوست کے جاؤ۔ فلاں منزل پر قیام کرو۔ مکان پر پہنچکر ہاتھ دھوؤ۔ کھانا کھاؤ۔ پانی پیو۔ پھر گھر پلٹ آؤ۔ آپ یقیناً یہی جواب دیں گے کہ جو کچھ میں نے کیا وہ روح کی خواہش اور اُس کے منشاء کے مطابق تھا۔ لیکن اس کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچی۔ روح نے چلنے کا ارادہ کیا۔ جسم حرکت کرنے لگا۔ جس منزل پر اس نے ٹھیرنے کا ارادہ کیا۔ اسی منزل پر جسم ٹھیر گیا۔ روح نے کھانے کا ارادہ کیا ہاتھ کھانے کی طرف بڑھنے لگا۔ دہن اپنی حرکت میں مشغول ہو گیا۔ جب روح نے پلٹنے کا قصد کیا جسم نے واپسی حرکت کی۔ اس لئے مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ جب روح کا خاموش حکم اقلیم بدن میں اثر کرتا ہے تو اُس خدا کا خاموش حکم جو روح کا خالق ہے اور اس سے کہیں زیادہ صاحب قدرت ہے بطریق اولیٰ عالم کی سلطنت میں اثر کر سکتا ہے۔ خدا اور روح کی طاقت میں وہی نسبت ہے جو ایک خالق اور اس کے ادنیٰ مخلوق میں ہونی چاہیے۔ دُنیا کا کون عقلمند اس امر کو تجویز کر سکتا ہے کہ روح بغیر آواز کے اپنے احکام جاری کرے اور اس کا خالق بغیر آواز کے اپنے احکام نافذ نہ کر سکے۔ بلکہ بولنے والے حاکم کی بہ نسبت خاموش حاکم کا اثر فطرتاً زیادہ ہونا چاہیے۔ روح اگر بولتی تو یہ ممکن تھا کہ کبھی اس کے الفاظ میں لکنت ہو جاتی یا کان سُننے میں تاخیر کرتے۔ اس کے علاوہ روح

کتنا ہی آہستہ کان میں کہتی لیکن غیر کے سننے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے روح
کے خاموش حاکم ہونے نے ان تمام رازوں کو سربستہ کر دیا۔ جو ایک حاکم اور محکوم
کے درمیان سربمہر ہونے چاہئیں۔ جب لفظ کا صادر ہونا روح کی حاکمیت کے
پوزیشن کے خلاف ہے تو شان الوہیت کے بطریق اولیٰ خلاف ہوگا۔ قدرت
نے روح کو حاکم بنا کر عالم کو یہ بتا دیا کہ جب روح اپنے احکام میں لفظوں کی
محتاج نہیں ہے تو میں کیونکر لفظوں کا محتاج ہو سکتا ہوں۔ جب روح کی یہ
شان ہے تو میری شان اس سے اعلیٰ اور ارفع ہوگی۔ میری حاکمیت کا نمونہ
روح کی حکومت ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کیا جائے کہ قدرت کے
زبان ہے تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ وہ آلات مادی سے مرکب ہے اور ہر مرکب
اپنے اجزائے ترکیبی میں دوسرے کا محتاج ہوتا ہے اس لئے خدا بھی کسی دوسری
ہستی کا محتاج ہوگا۔ حالانکہ خدا محتاج نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ
اس کے زبان نہیں ہے نہ اس کو لفظ کُن کہنے کی ضرورت ہے بلکہ جس طرح
روح کی مشیت میں کُن کا مفہوم گزرتا ہے اور وہی فعل عدم سے وجود میں
آجاتا ہے۔ اسی طرح قدرت کی مشیت میں کُن کا مفہوم گزرا اور فوراً وہ فعل
ظہور میں آگیا۔ اگر خدا لفظ کن کہتا تو اس آواز اور فعل کے وجود میں قانون فلسفہ
کے مطابق تاخیر ہوتی۔ کیونکہ ایک وہ آن ہوگی جس میں لفظ کا آخری حصہ ختم
ہوا ہے اور دوسری وہ آن ہوگی جس میں فعل کی ابتدا ہوئی ہے۔ اور ہر دو

آنوں کے درمیان زمانہ کا ہونا ضروری ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ لفظ صادر ہو اور زمانہ کی تاخیر نہ ہو۔ لہٰذا اگر خدا لفظ کُن کہتا تو شے فوراً عدم سے وجود میں نہ آتی جو شان الوہیت کے خلاف ہے۔

اگر خدا لفظ کن کہتا تو اس کے لئے جگہ معیّن ہو جاتی

مجبوراً یہ بھی ماننا ہوگا کہ جہاں سے آواز پیدا ہوئی ہے وہ جگہ معیّن ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی آواز آئے اور اس کے متعلق یہ نہ کہہ سکیں کہ یہ صدا مشرق یا مغرب یا جنوب یا شمال وغیرہ کی طرف سے آئی۔ بولنے والا ہمیشہ مقام معیّن سے بولتا ہے۔ یہ بھی فلسفہ کا قانون ہے کہ جو شے جگہ کی محتاج ہوگی وہ مادی ہے۔ کیونکہ تمام فلاسفران عالم کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ مادیات کے علاوہ کوئی شے جگہ کی محتاج نہیں۔ اس لئے اگر یہ فرض کیا جائے کہ خدا سے لفظ صادر ہوا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مادی ہے۔ حالانکہ خدا مادی نہیں ہو سکتا ورنہ اس کے لئے حدوث وفنا لازم ہوں گے۔ جو شان الوہیت کے خلاف ہیں۔

باب ۲۰

خدا اگر عبادت کا محتاج نہیں ہے تو اس نے کیوں عبادت کا حکم دیا۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس، حج، اور جہاد کے واجب ہونے میں کیا فلسفہ ہے، یہ بھی ممکن تھا کہ پانچ وقتوں کے بجائے تین وقتوں کی نماز واجب ہوتی۔ پھر خدا نے پانچ وقتوں کی نماز کیوں واجب کی

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ باپ بیٹے کی تعظیم کا اور استاد شاگرد کی اطاعت کا محتاج نہیں ہے۔ بیٹا تعظیم کرے یا نہ کرے۔ شاگرد مطیع ہو یا نہ ہو۔ لیکن باپ کی عظمت اور استاد کی جلالت میں فرق نہیں آتا۔ اسی طرح معبود حقیقی مخلوق کی عبادت کا محتاج نہیں ہے۔ مخلوق کی سرکشی سے اس کی عظمت وجلال میں کمی نہیں ہوتی اور اطاعت سے اضافہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی ذات منتہائے استغنےٰ میں ہے آج تک ہزاروں عابد گزرے۔ لاکھوں رشی و ولی آئے۔ بڑے بڑے لَو لگانے

والوں نے ریاضت کے مصلے بچھائے۔ فقیروں نے سربفلک پہاڑوں کے دامنوں میں دھونیاں رمائیں۔ آتش کدہ آباد کئے۔ صوفیوں نے مسجدوں اور خانقاہوں میں اللہ ہو کی صدا لگائی۔ پنڈتوں نے رام کا ناقوس بجایا۔ لیکن اس کی سلطنت میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہوا۔ اسی طرح فرعون و نمرود جیسے بارعب بادشاہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ مگر اس کی حکومت میں ایک انچ کمی نہ ہوئی۔ جس نے جو کچھ کیا۔ اسکی اچھائی یا بُرائی کا نتیجہ اُسی کی طرف پلٹا۔ اس لئے خدا نے جو قانون عبادت دنیا میں بھیجا۔ اس میں ہمارے ہی مفاد کا راز مضمر تھا۔ انسان روح اور جسم سے مرکب ہے اِس لئے اس نے اس قانون سے دونوں کی اصلاح کی۔ اگر خدا کا بنایا ہوا قانون دُنیا میں نہ آتا تو انسان کا ذاتی فریضہ تھا کہ اپنی نوع کے تحفظ کے لئے مناسب قانون تجویز کرتا۔ کیونکہ اس میں تغافل سے اس کا ذاتی نقصان تھا۔ قدرت کا یہ احسان ہے کہ اس نے جسمانیت اور روحانیت کی بہبودی کے لئے وہ منضم قانون بھیجا جس کو انسان لاکھوں برس کے تجربہ کے بعد بھی نہ بنا سکتا۔

قانون نماز کا حقیقی فلسفہ

نماز کے اجزا ترکیبی میں وحدت اور اس کی ثنا رکن اعظم ہے اس لئے نفس کی پاکیزگی، روحانی ترقی قلب کی صفائی کا اعلیٰ ذریعہ نماز ہے۔ کسی شخص کی روحانیت کے یہ معنی ہیں کہ عابد اور معبود کے تعلقات میں خوشگوار نسبت ہے۔ نماز ان تعلقات میں اضافہ کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ کیونکہ اس کا شیرازہ توحید سے بندھا ہوا ہے۔ نماز

انسان کو ان تمام اخلاقی فرضوں کو یاد دلاتی ہے۔ جو قدرت کے متعلق اس کی طرف عاید ہیں۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کا اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اپنے محسن کو فراموش نہ کرے۔ نماز ہی وہ ہے جو انسان کی اس کے محسن کی طرف توجہ مبذول کرتی ہے اور اس کے بھولے ہوئے فرض منصبی کو یاد دلاتی ہے۔ نفس کی ریاضت کا عالم اجسام پر کیا اثر ہوتا ہے اس کے متعلق تاریخیں شاہد ہیں کہ عبادت گزاروں اور نفسانی خواہشات کے فنا کرنے والوں نے اُن عجائبات کا مظاہرہ کیا جو سلاطین اولی العزم کی طاقتوں سے بالاتر ہیں۔ ان کی ایک آہ کا اثر شاہی فوجوں کی ڈھالیں نہ روک سکیں۔

نماز دوسرے مذاہب کی عبادتوں کی بہ نسبت نفس کی پاکیزگی کا اعلیٰ سبب ہے کیونکہ نماز کا ادا کرنے والا دوسرے پجاریوں کی طرح توحید میں کسی کو مشترک نہیں کرتا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ دوسرے مذہبوں کے عاملوں اور عالموں کے چلے کھینچنے کے باوجود الفاظ میں وہ تاثیر نہیں ہوتی جو اسلامی رہنما کے الفاظ میں ہوتی ہے۔

پانچ وقتوں کی نماز کے واجب ہونے اور رکعات میں زیادتی کمی کا فلسفہ

پنج وقتہ نماز کی تخصیص اور رکعتوں کی کمی و زیادتی کی فلاسفی سے قبل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ روح اور جسم کے تعلقات متحد ہیں اس لئے ان کی صحت اور مرض

کے اوقات بھی ایک ہونے چاہئیں۔ روح اور جسم کے باہمی تعلقات کا یوں اندازہ
ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص جسم پر چاقو مارے یا پھوڑا اُ پھنسی کی وجہ سے زخم ہو جائے
تو روح کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آپ کو گالیاں دے
تو ظاہر ہے گالیوں کی تکلیف سے جسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن روح کی تکلیف
سے جسم اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ آپ کی پیشانی پر فوراً بل پڑ جائیں گے جب روح
خوش کن باتیں سُنتی ہے تو چہرے سے آثار مسرت ظاہر ہوتے ہیں۔ روح و جسم
میں ہر ایک کا دوسرے کی تکلیف یا خوشی سے متاثر ہونا ان کے ان باہمی بدیہی
تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے جس کا بے وقوف ترین انسان بھی انکار نہیں کر سکتا
کیونکہ یہ روزمرّہ کا تجربہ ہے کہ روح کو صدمہ پہنچنے سے جسم سست ہو جاتا ہے
اور جسم کے علیل ہونے سے روح بے چین ہو جاتی ہے۔ ان کے تعلقات اتحادی
کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اوقات مرض بھی متحد ہوں۔ جن اوقات میں جسم پر مرض کا شدید
حملہ ہوتا ہے ان ہی اوقات میں روح پر شدّت ہوتی ہے اسی طرح کمی کے
اصول ہیں دونوں مساوی ہیں۔ اس لئے دوا کے استعمال کرنے میں اُن اوقات
کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ یہ بھی امر قابل نظر انداز نہیں ہے کہ جب مرض کا حملہ
سخت ہوتا ہے تو دوا قوی اور زیادہ مقدار میں پلائی جاتی ہے اور جب مرض گھٹتا
ہے تو دوا کمزور اور تھوڑی مقدار میں دی جاتی ہے۔ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے
میں یہ عرض کرتا ہوں کہ صبح کے وقت سخت ترین مرض بھی ہلکا ہو جاتا ہے

رات بھر کروٹیں بدلنے والے مریض نسیم سحری کے جان بخش جھونکوں سے آنکھ لگا لیتے ہیں۔ چوبیس گھنٹہ میں مریض کے لئے سب سے زیادہ اچھا وقت صبح کا ہے میں اس سے پہلے یہ عرض کر چکا ہوں کہ جسم و روح کے باہمی تعلقات اتحادی کی وجہ سے ان کے اوقات صحت و مرض بھی متحد ہیں۔ اس لئے یہ ماننا ہوگا کہ صبح کے وقت روح کا مرض بھی کمزور ہوگا۔ اس لئے قدرت نے دوا کی تھوڑی مقدار مقرر کی۔ یعنی دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ دوپہر کو مرض شدید ہوجاتا ہے اس لئے دوا کی مقدار بڑھادی یعنی چار رکعت ظہر کے لئے اور چار عصر کے لئے مقرر ہوئیں۔ مغرب کے وقت پھر مریض کے مرض میں کمی ہوتی ہے اس لئے دوائے روحانی کی مقدار گھٹادی لہذا مغرب کی تین رکعت مقرر کیں۔ رات کو پھر مرض میں شدت ہوجاتی ہے۔ اس لئے دوائے روحانی کی مقدار بڑھادی لہذا عشار کی چار رکعتیں مقرر کیں۔

آدم کی یادگار نمازِ صبح

اس کے علاوہ یہ امر بھی ناقابل اغماض ہے کہ ہر قوم اپنے مشہور بزرگوں کی یادگار مناتی ہے۔ اسی یادگار پر قوموں کی موت وحیات کا اہم سوال منحصر ہے۔ جب تک کسی قوم میں اس کے بزرگوں اور رہنماؤں کے آثار باقی ہیں وہ زندہ کہلانے کی مستحق ہے بلا تفریق مذہب تمام قومیں اپنی مردہ قومیت میں دم عیسیٰ پھونکنے اور سوئی ہوئی ترقی کے جگانے کے لئے اسلاف کا راگ گاتی ہیں۔ اسلام نے بھی ان مقتدر ہستیوں

کی یادگار قایم کی جو دُنیاے انسانی میں قدرت کا مظہر بن کر آے تھے۔ دُنیا میں آنے کے بعد آدم اندھیری رات کے سناٹے سے گھبرائے۔ صبح کے وقت شکرانے کی دو رکعت نماز پڑھی۔ اس لئے اسلام نے صبح کی دو رکعت نماز مقرر کر کے آدم کی یادگار قایم کی۔

آتش پرستوں کے دیوتا کے زوال کی یادگار۔ نماز ظہر

آفتاب آتش پرستوں کا دیوتا ہے وہ ہمیشہ اس کو پوجتے ہیں۔ آفتاب کا زوال ان کے مفروضی دیوتا کا زوال ہے یہ زوال جناب ابراہیم کے اس استدلال کی تائید ہے جو آپ نے اُن قوموں کے سامنے پیش کیا تھا جو آفتاب کو خدا تسلیم کرتی تھیں۔ اسلام نے اس استدلال کے قایم رکھنے کے لئے مفروضہ خدا کے زوال پر خدائے حقیقی کے شکریہ میں نماز ظہر مقرر کی۔

جناب ابراہیمؑ کی یادگار۔ نماز عصر

ایک طرف خدا کا خلیل لق و دق میدان میں اپنے بیٹے کی قربانی کے لئے خنجر بکف ہے۔ دوسری طرف اسمٰعیلؑ کی چاند سی صورت۔ ماں کی تڑپ۔ ہدیہ کی قبولی۔ امتحان میں کامیابی کا عظیم الشان تردد ابراہیم کو بے چین کر رہا ہے۔ خدا نے ہدیہ قبول کیا اور اسمٰعیل کے بجائے دُنبہ کو قربانی کے لئے بھیج دیا۔ جناب ابراہیمؑ نے اس کے شکریہ میں چار رکعت نماز عصر کے وقت ادا کیں۔ اسلام نے اس اہم ترین قربانی

کی یادگار نماز عصر کی صورت میں قایم کی۔

جناب یعقوبؑ کی یادگار۔ نمازِ مغرب

برسوں کی مفارقت کے بعد جب جناب یعقوبؑ نے یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو سونگھی تو تین رکعت نماز مغرب کے وقت شکرانہ کی ادا کی۔ اسلام نے جناب یعقوبؑ کی یادگار قایم کرنے کے لئے نماز مغرب کی تین رکعت نماز مُقرر رکیں۔

نمازِ عشا

نیند میں ان روحانی اسرار کا انکشاف ہوتا ہے جنکا اظہار بیداری میں نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان سوتے وقت جس قدر روحانیت سے متصل ہوگا۔ مکاشفات زیادہ ہوں گے۔ اس لئے اسلام نے نماز عشا کا حکم دیا تاکہ سوتے وقت انسان روحانیت سے ملحق رہے۔ اس کے علاوہ جب جناب آدمؑ زمین پر آئے اور اپنے جسم پر رنج وغم سے سیاہی دیکھی تو اس کے دفع کرنے کے لئے پانچوں وقت کی نماز ادا کی۔ اس لئے پنج وقتہ نماز سب سے پہلے انسان کی دُعا کی یادگار ہے۔

روزہ کے واجب ہونے کا فلسفہ

روزہ روحانی اور جسمانی مفاد کے لئے مشترک ہے اس سے جہاں روحانی اصلاح ہوتی ہے جسمانی اصلاح بھی ہوتی ہے۔ ان گزشتہ فلسفیوں کی داستانیں پڑھنے سے جو حکمائے اشراق کے نام سے موسوم ہیں۔ اِس امر کا

صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ روزہ روحانیت کی ترقی اور انکشافات اسرار کا سب سے بڑا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون اور تابعین افلاطون روزہ رکھ کر تہوں میں خاموش بیٹھتے اور فلسفہ کی الجھی ہوئی گتھیاں اشراق سے سلجھاتے تھے فلسفہ کی کتابیں اس بارہ میں خاموش نہیں ہیں کہ افلاطون نے علم اشراق میں عظیم الشان ترقی کی۔ بعض اسلامی فلسفیوں کا خیال ہے کہ یہ لوح وقلم تک پہنچ چکا تھا۔ کیونکہ اس نے ایک ایسے عالم کو دُنیا کے سامنے پیش کیا جس کی صفات لوح وقلم سے ملتی جلتی تھیں۔ اس نے بیان کیا کہ اس دُنیا کے علاوہ ایک اور عالم ہے۔ وہ عالم روحانی اصل ہے اور ہماری دُنیا اس کی نقل و پرتو ہے۔ جو کچھ اُس عالم میں ہوتا ہے وہی بعینہ یہاں ہوتا ہے اسی کو فلسفہ کی اصطلاح میں مثلِ افلاطونیہ کہتے ہیں۔ افلاطون نے اس قدر بے پایاں ترقی کیونکر کی۔ ریاضت کی اس منزل تک کیونکر پہنچا؟ صرف اس لئے کہ وہ روزہ کے بے عدیل قانون کا پابند تھا۔ بلاتخصیص مذہب ہر قوم اپنی روحانی اور جسمانی اصلاح کے لئے روزہ رکھتی ہے۔ دوسری اقوام اور اسلام کے روزہ میں فرق یہ ہے کہ اسلام نے اس کے لئے ایک منظم قانون بنایا ہے اور دوسری اقوام نے کوئی منظم قانون نہیں بنایا یہودی، عیسائی، پارسی، ہندو، غرض ہر قوم قانون روزہ سے فائدہ اُٹھاتی ہے اکثر ہندو اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے روزہ رکھتے ہیں۔ دور حاضرہ میں جبکہ سوراج کی علمبرداری کے بعد ہندو مُسلم اختلاف رونما ہوا تو مسٹر گاندھی نے دونوں

قوموں کے اتحاد کے لئے روزے رکھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روشن دماغ ہندو یا یوں کہوں کہ پالٹیکس میں ڈوبے ہوئے انسان بھی روزہ کو دُنیوی مفاد کا اعلیٰ ذریعہ سمجھتے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ۔ طب اور ڈاکٹری کے اصول پر روزہ بکثرت امراض کی تیر بہدف دوا ہے۔ کیونکہ اکثر امراض شکم پُری سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انسان فاقوں کا عادی ہو جائے یا بھوک سے کم کھائے تو امراض کا شکار نہ ہوگا۔ شکم پُری سے جسم میں سُستی اور حواس خمسہ میں کندی ہوتی ہے۔ ان کے دفع کرنے کا واحد ذریعہ روزہ ہے۔ اگر دُنیا کی تمام قومیں قانون اسلام کی پابندی کیساتھ سال بھر میں کم از کم ایک ماہ روزہ رکھیں تو بغیر دوا کے مادہ فاسدہ کا قلع قمع ہو سکتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ صحت کا تناسب بڑھ جائے گا۔ اسلامی روزہ کا راز دوسری اقوام پر صحیح طور سے اس لئے نہیں کھلتا کہ مسلمان اصول صحت کے برخلاف غذائیں استعمال کر کے روزہ کی منفعت پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ روزہ کی حرارت ان جراثیم کو فنا کر دیتی ہے جو مادہ فاسدہ سے جسم میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے عموماً امراض کے علاج میں ترک غذا کی تاکید ہوتی ہے۔ روزہ حسب ذیل امراض کیلئے بالخاصہ مفید ہے

لقوہ۔ فالج۔ کزاز رطبی۔ حد سے بڑھا ہوا موٹاپا۔ بخار۔ نزلہ۔ زکام۔ کھانسی۔ بدہضمی دست۔ ریاح۔ نمونیا۔ ٹائیفائڈ فیور۔ درد شکم وغیرہ۔

زکوٰۃ وخمس کے واجب ہونے کا فلسفہ

بنی نوع انسان متمدن بالطبع ہونے کی وجہ سے اپنی حیات وممات میں اشتراک عمل کے محتاج ہیں۔ جب تک اشتراک عمل نہ ہوگا صحیح زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اگر رئیس اپنی ریاست میں مغرور اور غریب اپنی غربت میں مست رہے تو نظام عالم کے مستحکم ستون متزلزل ہو جائیں۔ اشتراک عمل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمام افراد انسانی ایک کام کریں۔ اگر ایک شخص معماری کرتا ہے تو تمام انسان معماری کرنے لگیں بلکہ اشتراک عمل کے یہ معنی ہیں کہ جو جس کام کے قابل ہے۔ اس سے دریغ نہ کرے۔ غریب مزدوری کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ رئیس اُس کو اُجرت دے سکتا ہے۔ غریب کی محنت اور رئیس کی اجرت ہی اشتراک عمل ہے۔ عمل کے اعتبار سے بنی نوع انسان کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض تاجر ہیں بعض کاشتکار بعض صناع۔ بعض زمیندار۔ اگر ان میں اشتراک عمل نہ ہو تو نظام عالم کا خاکہ اُلٹ جائے۔ کیونکہ رئیس اپنے مال کے باوجود کھانے، پینے، پہننے کی ضرورتوں میں دوسرے کا محتاج ہے۔ اسی طرح ان میں ہر ایک اپنی حیات اور ممات میں دوسرے کی اعانت کا ضرورتمند ہے۔ اسلام نے اشتراک کو قایم کرنے کے لئے زکوٰۃ اور خمس کا بے عدیل قانون دُنیا کے سامنے پیش کیا جس پر بنی نوع انسان کا تمدن موقوف تھا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہوں کہ دُنیا کی ہر گورنمنٹ رعایا سے ٹیکس لیتی ہے تاکہ غریب پبلک اس سے فائدہ حاصل کرے اسی طرح اسلام نے روٴسا پر شرعی ٹیکس جس کا نام زکوٰۃ خمس ہے قایم کر کے محتاج

پبلک کی اعانت کی۔ اگر روپیہ سرمایہ پر شرعی ٹیکس نہ ہوتا تو مفلس مزدور پارٹی سرمایہ دار ان کے پیروں سے کچل جاتی۔ بلکہ حقیقتاً دنیا سے نیست و نابود ہو جاتی۔ اسلام سے پہلے سرمایہ داروں کی نگاہ میں مزدور پارٹی بالکل حقیر تھی۔ رفتہ رفتہ جب اسلام کا پھریرا مشرق اور مغرب کی طویل فضا میں لہرانے لگا۔ تہذیب کی خوشگوار ہوا بدتہذیبی کے کھنڈروں میں چلی تو مزدور پارٹی نے جو سرمایہ داروں کے مقابلہ میں مردہ ہو چکی تھی۔ قانون زکوٰۃ و خمس کی بدولت سنبھالا لیا۔ اسلام کے اثرات جس قدر عالمگیر ہوتے گئے اتنے ہی مزدور پارٹی کی عزت میں چار چاند لگے۔ اسلام سے قبل سرمایہ داروں کی جماعت مزدور پارٹی کو غلاموں سے بدتر جانتی تھی۔ پیغمبر اسلام نے جو گرتے ہوؤں کو سنبھالنے ضعیفوں کو قوی بنانے۔ اپاہجوں کے سہارا لگانے کے لئے آئے تھے۔ ان کو قانون زکوٰۃ و خمس کے ذریعہ سرمایہ دار بنا کر غلامی کی بیڑیوں سے آزاد کر دیا۔ سلطنت کی زندگی اور اس کے عناصر کی بقا کے لئے خزانہ شاہی کا ہونا ضروری ہے۔ آج تک کوئی سلطنت ایسی نہیں ہوئی جو خزانہ کے بغیر قایم رہی ہو۔ کیونکہ درحقیقت خزانہ ہی سلطنت کا روح رواں ہوتا ہے۔ سلطنت کی شادابی۔ غیروں کے حملوں کی مدافعت۔ اندرونی واقعات کی اصلاح۔ رعایا کی بہبودی۔ اس وقت تک ناممکن ہے کہ شاہی فنڈ روپے سے لبریز نہ ہو۔ انہی امور کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلام نے شاہی فنڈ یعنی بیت المال مقرر کیا۔ جو زکوٰۃ و خمس کے روپے سے پُر رہتا تھا

اس کے علاوہ قانون زکوٰۃ و خمس نے اُن غربا اور رؤسار کے درمیان جن میں امتیاز کی حدفاصل تھی مواسات قایم کی. اگر زکوٰۃ اور خمس کا قانون نہ ہوتا تو مختلف حیثیت والے طبقات میں کبھی یکجہتی اور مواسات نہ ہوتی. کیونکہ مواسات اور اتحاد باہمی ضروریات پر مبنی ہیں جس قدر باہمی ضروریات بڑھتی جائیں گی اتنے ہی محبت کے جذبات قوی ہوں گے. اگر کسی باپ کے چار بیٹے ہوں اور ان میں سے ایک اس کی اعانت کرتا رہے تو باپ اپنے اسی بیٹے سے محبت کرے گا جو اس کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے. جب رشتہ داری. دوستانہ اور اتحاد ضرورتوں پر مبنی ہیں تو تمدن کا واحد حل ان ہی ضروریات کا پورا کرنا ہے. اور ضرورتوں کا پورا کرنا زیادہ تر روپے پر منحصر ہے. اس لئے قانون زکوٰۃ و خمس ہی تمدن کا اعلیٰ ذریعہ ہو سکتا ہے. بعض ایسے غیر تمند غریب بھی ہیں جو اپنی قوت بازو کی کمائی کے علاوہ دوسروں کی دولت کو نظر بھر کے دیکھنا عیب سمجھتے ہیں، انہیں بھوکا مرنا گوارہ ہے لیکن کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا بدترین فعل سمجھتے ہیں. اس لئے اسلام نے خمس کی ایک رقم اپنے لئے مقرر کی تاکہ غربا اپنے حقوق کے لینے میں نہ جھجکیں قاعدہ ہے کہ جس چیز کو معززین پسند کرتے ہیں اس کو غریب طبقہ بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے. اسلام کے ذمہ دار افراد نے اس میں اپنا حصہ مقرر کر کے غربا کو شرمندگی سے بچالیا. یہ ممکن تھا کہ بعض نا اہل رؤسار غربا کو طعنے دیتے لیکن جبکہ اسلامی بادشاہ کا حصہ اس میں مقرر ہے تو غربا طعنوں کا نشانہ نہیں بن سکتے. یہ بھی نہ سمجھنا

چاہئے کہ زکوٰۃ و خمس کے نکالنے سے مال میں کمی واقع ہوتی ہے۔ کیونکہ تاریخ اور
تجربہ سے اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ کہ آج تک کوئی رئیس زکوٰۃ و خمس دینے کی
وجہ سے غریب ہو گیا ہو۔ کیونکہ باغبان جس قدر درختوں کی شاخوں کو تراشتا ہے
اتنا ہی وہ سرسبز و شاداب اور بر آور ہوتا ہے۔ بظاہر درخت میں کمی ہوتی ہے
لیکن نتیجہ میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ و خمس دینے سے مال میں
بظاہر کمی ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس میں اضافہ ہوتا ہے۔

اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو قانون زکوٰۃ رؤسار کو تعیش سے روکنے
کا آلہ ہے۔ کیونکہ انسان فطرتاً اس مال کو بیجا صرف کرنے کے بجائے حفاظت کرتا
ہے جس کا وہ امین ہو۔ اپنے مال میں نقصان برداشت کرتا ہے لیکن امانت میں
خیانت پسند نہیں کرتا۔ اسلام نے قانون زکوٰت و خمس قایم کرکے یہ بتا دیا کہ
رؤسا غربا کے اُن حقوق کے امین ہیں جو ان کی ملکیت کا جز ہیں۔ اس لئے اگر وہ
اپنا مال سمجھکر بے جا صرف کرنا چاہیں تو کم از کم غربا کے حقوق کو مدّ نظر رکھتے ہوئے
بے جا اصراف سے بچے رہیں۔

اس کے علاوہ ہر اس چیز کے لئے جس کو قدرت نے خلعت حیات عطا
کیا ہے۔ ایک مصرف جائز ہے۔ آنکھیں اس لئے ہیں کہ انسان جائز چیزوں کو
دیکھے ناجائز کو نہ دیکھے۔ ہاتھ اس لئے ہیں جائز کسب کرے۔ اپاہجوں کی اعانت
کرے۔ زبان اس لئے ہے کہ جائز کلام کرے۔ مظلوم کی اعانت کرے۔ اِسی

طلبِ مال اس لئے ہے کہ اس سے غریبوں، اپاہجوں اور مسافروں وغیرہ کی اعانت کی جائے۔ اسلام نے قانون زکوٰت وخمس قایم کر کے انسان کو اس حقیقی فرض سے آگاہ کیا۔

حج کے واجب ہونے کا فلسفہ

(۱) میں قانون زکوٰۃ کی ابتدائی تمہید میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ انسان متمدن بالطبع ہونے کی وجہ سے اشتراک عمل کا محتاج ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی شخص معماری دری، بڑھئی، کاشتکاری، زمینداری کے مختلف پیشوں کا متحمل ہو۔ اس لئے انسانی برادری کی بقا کے لئے اشتراک عمل کا ہونا ضروری ہے۔ ہر شخص کا یہ فریضہ ہے کہ کسی نہ کسی فن میں تکمیل کر کے دوسروں کی امداد کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی ذات پر تمام پیشوں کی ذمہ داری لے اور دوسروں کی احتیاج سے اپنے کو مستغنی سمجھے تو نظام عالم درہم و برہم ہو جائے۔ سرمایہ دار اور مزدور پارٹی میں طبعی بعد ہوتا ہے اس لئے اسلام نے حج کا فریضہ قایم کر کے سرمایہ دار اور مزدور پارٹی کو اشتراک عمل کی دعوت دی تاکہ یورپ کا تاجدار اور عرب کا بدو اس فریضۂ مذہبی کے سلسلہ میں بغیر کسی امتیاز کے ایک ہی صف میں کھڑے ہوں اور اس امر کا ثبوت دیں کہ بنی نوع انسان کے منتشر دانے عام اس سے کہ بڑے ہوں یا چھوٹے عملاً ایک ہیں۔ اس اشتراک عمل سے اس منافرت کا باب بند ہو جاتا ہے جو سرمایہ دار اور مزدور پارٹی کے درمیان فطرتاً ہوتی ہے۔

(۲) انسان فطرتاً حسب نسب، دولت اور لباس کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فخر کرتا ہے۔ رئیس غریب کو افلاس کی وجہ سے حقیر سمجھتا ہے۔ شریف رذیل کو حسب و نسب کی وجہ سے ذلیل جانتا ہے۔ پست طبقہ بلند طبقہ کو حسد کی نگاہ سے نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسلام نے حج کا فریضہ قایم کر کے تمام وہ امتیازات انسانی مٹا دئے جو باہمی منافرت کے باعث ہیں۔ قانون حج کے ماتحت رئیس و غریب شریف و رذیل میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ جس طرح ایک غریب صفا و مروہ کے درمیان دوڑتا ہے اُسی طرح دُنیا کا سب سے بڑا تاجدار دوڑتا ہے۔ جس طرح ایک مفلس طواف کرتا ہے اسی طرح عالم کا سب سے بڑا تخت نشین طواف کرتا ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہ رؤسار و حکام کی صفیں آگے ہوں اور غریبوں کی پیچھے۔ یا غربا کو یہ حکم ہو کہ تم رؤسار سے کسی عمل میں تقدیم نہ کرو۔

(۳) قوم اُسی وقت قوم کہلانے کی مستحق ہے جبکہ اس کا شیرازہ بندھا ہُوا ہو۔ انسان کی چند منتشر افراد کو قوم نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لئے قوم کے منتشر افراد کے اجتماع کے لئے دُنیا میں مختلف سوسائٹیاں قایم ہوئیں جو کانگریس کانفرنس اور لیگ کے نام سے موسوم ہیں۔ اگرچہ ان تمام کا نظریہ یہی ہے کہ تمام بنی نوع انسان واحد حیثیت سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں لیکن اتحاد و مساوات کے قایم کرنے میں ان کا کامیاب ہونا غیر ممکن ہے۔ کیونکہ ان میں عموماً ملکی اور قومی امتیازات کے ساتھ نمایندے جاتے ہیں اور ان کا مقصد اعظم اِس

ملک یا قوم کی جنبہ داری ہوتی ہے جس کی طرف سے وہ نمایندے بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی وقت کانگریس یا کانفرنس وغیرہ دُنیا کی تمام انسانی برادری کے لئے مُفید لائحہ عمل پیش کر سکیں گی۔ اسلام کی قایم کردہ بین الاقوامی کانفرنس جس کو حج سے تعبیر کیا جاتا ہے ان امتیازات کو متنفر نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس میں عالم، جاہل۔ متمدن، غیر متمدن، رئیس، غریب کے حقوق مساوی ہیں۔ یہاں زرّیں تخت کا وارث اور گدڑیاں لپیٹنے والا فقیر ایک نظر آتے ہیں۔ گورے۔ کالے۔ ایشیائی۔ یورپین میں امتیاز نہیں ہے۔ یورپین ہیٹ لگاتا ہے کوٹ پتلون پہنتا ہے۔ عرب عمامہ باندھتا ہے۔ عبا قبا پہنتا ہے۔ ہندی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی اوڑھتا ہے۔ اچکن پہنتا ہے۔ اسی طرح ہر ملک کا ایک لباس ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ مگر جب اسلامی بین الاقوامی کانفرنس میں ان لباسوں کے پہننے والے آتے ہیں تو سب کا لباس ایک ہوتا ہے۔ اب کوئی نہ یورپین رہا نہ ہندی و عرب بلکہ یہاں آکر تمام بنی نوع انسان سگے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے موتمر اسلامی ہی حقیقی اتحاد و مساوات کی علمبردار ہو سکتی ہے۔

(۴) آپ ہزار دس کوس کی آواز ریڈیو کے ذریعہ سُن سکتے ہیں۔ تار اور ٹیلیفون کے ذریعہ اپنی صدا میلوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن وہ فاقوں کا مارا ہوا غریب جو ضعف سے سیدھا کھڑا نہ ہو سکے اتنا روپیہ کہاں سے لائے کہ اپنی درد بھری

داستان عالم بھر کو سُنا دے۔

یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ غریب کے ذہن میں کبھی ایسا نظریہ آئے جو مذہبی یا سیاسی اعتبار سے ملک کے لئے مفید ہو۔ کیونکہ بعض اوقات رئیس و حاکم کے عالی دماغ میں وہ تخیل پیدا نہیں ہوتا جو ایک غریب کے دماغ میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ریاست و غربت بُلند خیالی کا معیار نہیں ہیں۔ اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ غریب رئیس سے عالی دماغ ہو۔ لیکن غریب کا اعلیٰ نظریہ قایم کرنا بیکار ہے جب تک وہ اپنے ضمیر کا فتویٰ تمام عالم کو نہ سُنائے۔ اور یہ امر اس کیلئے غربت کی وجہ سے ناممکن ہے۔ ہاں اس کا اگر کوئی حل ہو سکتا ہے تو وہی بین الاقوامی کانفرنس جو ہر سال مکہ کی مقدس سرزمین پر ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ایک غریب ہندوستان کے گاؤں کا رہنے والا یہ چاہتا ہے کہ اپنی آواز بغیر خرچ کئے ہوئے عالم کو سُنائے تو اپنا نظریہ اس شخص سے کہے گا جو اس فریضۂ عظیم کے ادا کرنے کے لئے مکہ جا رہا ہے اور اسے یہ بھی تاکید کرے گا کہ وہ مکہ میں تمام حاجیوں کو میرا یہ پیغام پہنچا دے اور وہ اپنے قرب و جوار میں اس کو بعینہ پہنچا دیں۔ وہ حاجی مکہ میں جا کر حسب خواہش اس غریب کا پیغام تمام حاجیوں کو پہنچا دے گا۔ وہ حاجی اپنے اطراف میں سُنائیں گے۔ اسی طرح یہ خبر بغیر روپیہ صرف کئے تمام عالم میں پہنچ جائے گی۔ اگر اسلام حج کو قایم نہ کرتا تو غریب کی آواز ایک گوشہ میں محدود ہو کر رہ جاتی۔ اس لئے اس کا احسان ہے کہ اس نے سرمایہ دار اور مزدور پارٹی

کے لئے ایسا پلیٹ فارم بنایا جس پر دونوں فریق آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں۔

(۵) قوموں کے عروج و زوال اور بقا و فنا میں سابقین کی یادگار کو بڑا دخل ہے۔ وہ قومیں زندہ ہیں جو اپنے اسلاف کی یادگار مناتی ہیں اور وہ قومیں مردہ ہیں جو اپنے بزرگوں کے نقش قدم کو محو کر چکیں۔ عیسائی، یہودی، ہندو وغیرہ میں کوئی قوم ایسی نہیں جو اپنے رہنما کی یادگار نہ مناتی ہو۔ اسلام بھی اپنی بقا کیلئے ان آثار کو قائم رکھتا ہے جو اسلاف کی یادگار ہیں۔ حج سب سے زیادہ دو بزرگ ہستیوں کی یادگار ہے جناب آدمؑ اور جناب ابراہیمؑ۔ دُنیا میں پہلے آنے والے انسان نے جو آئین عبادت قائم کیا تھا۔ اس کو امتداد زمانہ نے مٹا دیا۔ مدت مدید کے بعد جناب ابراہیمؑ نے پھر وہ ہی دستور العمل دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ حقیقتاً حج کے تمام ارکان جو اسلام میں ہیں۔ ان ہی دونوں بزرگوار کے مقدس اعمال کی یادگار ہیں۔ حج کا دستور العمل نہ صرف مُسلمانوں کے لئے بلکہ تمام اقوام عالم کے لئے مفید ہے کیونکہ اس سے ایثار، نفس کشی، اتحاد و مساوات، توکل کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے۔

(۶) جب کسی قوم کا جلوس نکلتا ہے یا جلسہ ہوتا ہے تو دیگر اقوام مرعوب ہوتی ہیں جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے اسلام نے حج کی دعوت دیکر مُسلمانوں کا عظیم الشان اجتماع کیا۔ تاکہ دوسری اقوام مسلمانوں سے مرعوب رہیں۔

جہاد کے واجب ہونے کا فلسفہ

اسلامی جہاد کیا ہے۔ ڈراؤنا بھوت، لمبے لمبے دانتوں والی چڑیل، نوکیلے

سینگوں والا دیو جن کو دیکھ کر غیر مُسلم بہادر کانپ اٹھتے ہیں جن کے تخیل سے سوتے ہوئے شجاع چونک پڑتے ہیں۔ وہ تلوار اٹھی۔ وہ نیزہ سے خون ٹپکا۔ وہ برچھی سے کلیجہ چھدا۔ وہ تیر سے دل کے ٹکڑے ہوئے۔ مُسلمانوں سے بچو۔ ان سے بھاگو۔ بڑے خونخوار ہیں۔ یہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ نہیں نہیں غلط اور بالکل غلط۔ اسلامی جہاد نہ ڈراؤنا بھوت ہے نہ لمبے لمبے دانتوں والی چڑیل ہے نہ نوکیلے سینگوں والا دیو ہے؟ پھر وہ کیا ہے۔ درحقیقت وہ مذہبی اور قومی حقوق کے تحفظ کا قانون ہے۔ ہر قوم عام اس سے کہ نرم دل ہو یا سخت فطرتاً اپنے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔ جب کسی قوم کے ملکی یا مذہبی حقوق پر دوسرے حملہ کرتے ہیں تو ان کا دفاع اس قوم کا فرض منصبی ہے۔ اس لئے اسلام نے بھی قومی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کے لئے ایک قانون بنایا۔ جو ظاہر میں جہاد اور حقیقت میں دفاع تھا۔ اسلام نے جتنی جنگیں کیں ان کی نوعیت کو دیکھ کر ان کے دفاع ہونے میں ذرا شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ کیونکہ ان میں کوئی جہاد ایسا نہیں جس میں اہل اسلام نے اپنے حریف کی طرف سبقت کی ہو۔ جب تک اپنے دو چار آدمی قتل نہیں ہوئے اسلام کی تلوار نہیں اٹھی۔ عرب جنگجو سہی لیکن اسلام جنگجو نہیں۔ وہ ہر قوم کے ساتھ رواداری کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس نے سب سے پہلے انسان کو اپنے نفس سے جہاد کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ وہ نفس کے ناجائز حملوں سے اپنے کو بچائے یہی جہاد اکبر ہے اور اسی کو اسلام وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے

دوسرا وہ جہاد ہے جس کو دفاع کہنا چاہئے۔ کیونکہ اسلام نے نہ کبھی کسی کی دل آزاری
کی اور نہ لڑنے کی خواہش کی۔ ہاں دوسری قوموں کی طرح اسلام بھی اپنے حقوق
کے تحفظ میں خاموش نہیں رہا۔ اسلام کا حقیقی جہاد کیا ہے؟ قوی استدلال مکارم
اخلاق۔ خاموش مقابلہ تیرہ سو برس سے اس طرف کی تاریخ دیکھنے سے اس
سوال کا جواب حل ہوجاتا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا یا مکارم اخلاق سے؟
بعثت کی ابتدا ہے۔ عرب کا چپہ چپہ رسول عربی کا دشمن ہے۔ قریش کی قوی
تلواریں اور خطی نیزہ اس رہبر کامل کے خون کے پیاسے ہیں۔ اس وقت نام لینے
کو ہم خیال نہیں۔ جہاں پیغمبر اسلام تبلیغ کے لئے کھڑے ہوتے ہیں کفار کی خونخوار
تلواریں بیگناہ کے مقابل میں بلند ہوجاتی ہیں۔ کوئی مورخ یا محقق بتا سکتا ہے کہ
اس وقت رسول کا کیا فریضہ تھا۔ کیا رسول تلوار اٹھا کر کامیاب ہوسکتے تھے؟
ہرگز نہیں۔ اگر رسول ایسا کرتے تو ایک تلوار کے مقابلہ میں عرب کی نامحدود
تلواریں اٹھ کر بانی اسلام کا خاتمہ کردیتیں۔ اس لئے رسول نے کفار کا خاموش مقابلہ
کیا۔ کسی تاریخ سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ رسول نے ابتداء بعثت میں تلوار اٹھائی ہو
اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کا بتایا ہوا جہاد دشمن کے مقابلہ میں صبر و سکون
کے ساتھ خاموش مقابلہ ہے۔ یہی درحقیقت اسلام کی ترقی کا صحیح راز ہے۔ رہا یہ امر
کہ اسلام نے بعد میں تلوار سے بھی جہاد کیا۔ اس کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری
ہے کہ ہر قوم اپنے حقوق کے تحفظ میں جانی اور مالی قربانیاں پیش کرتی ہے۔ دور

حاضرہ میں جبکہ ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر تھی کس قدر ہندو اور مسلمانوں
نے جانی اور مالی قربانیاں دیں۔ اسی طرح اسلام نے مسلمانوں کو ان کے مذہبی
حقوق کے تحفظ کی خاطر قربانیاں پیش کرنے کا حکم دیا۔ درحقیقت قتل کرنا جوہر انسانیت
نہیں ہے بلکہ قتل ہونا اعلیٰ جوہر انسانیت ہے۔ کیونکہ قتل کرنے میں قاتل کو ایذا
نہیں ہوتی۔ اور انسان وہی ہے جو مصائب کو برداشت کرے اور چہرہ پر شکن
نہ پڑے۔ اسلام کا منشا یہ نہیں تھا کہ بنی نوع انسان کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا جائے
بلکہ اس کا مقصد اعظم تھا کہ انسان حق و صداقت کی راہ میں موت کی مہیب شکل کو
دیکھ کر متزلزل نہ ہو۔ بے گناہوں کو ستانا۔ مسافروں کو لوٹنا۔ محکموں کو اُجاڑنا۔
آبادیوں کو برباد کرنا اسلام میں ناقابل تلافی گناہ ہے۔ اس لئے اس نے جو
قانون جہاد بنایا۔ اس کا حقیقی منشا یہی تھا کہ مظلوموں کو ظالموں کے مضبوط پنجوں
سے چھڑیا جائے۔ اور ان کے ناجائز حملوں کو روکے۔ جو دین حق و صداقت
کے خلاف محاذ جنگ قایم کرتے ہیں۔

اسلام کو تلوار چلانے سے نفرت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی
جنگ میں حریفوں پر سبقت نہیں کی۔ بلکہ مخالفین کو بار بار حق اور صداقت کا
راستہ بتایا۔ جب متاثر ہونے کے بجائے ان کی طرف سے تلوار بلند ہوئی تب
مسلمانوں نے مدافعت کی کوشش کی۔ کوئی ایسی جنگ نہیں بتائی جاسکتی ہے
جس میں مسلمانوں کی طرف سے سبقت ہو۔ بلکہ اسلام نے مدافعتی جنگوں میں

حریفوں سے جو رواداری اور سلامت روی کی اس کی صفحات عالم پر نظیر ناممکن
ہے۔ اگر مذہبی حقوق کی حفاظت جنگجوئی کے مرادف ہے تو اس زد سے دُنیا کی
کوئی قوم نہیں بچ سکتی۔ ہندوؤں نے جن کے مذہب میں ایک معمولی جانور کا ذبح
کرنا گناہ عظیم ہے۔ مسلمانوں سے جنگیں کر کے کس قدر جانیں تلف کیں۔ اب سے
کئی ہزار برس قبل کورو پانڈو میں اس قدر سخت نبرد آزمائی ہوئی کہ سینکڑوں راجہ
مہاراجہ کام آ گئے۔ کیا میں دست بستہ عرض کر سکتا ہوں کہ جس مذہب میں معمولی
جانور کا مارنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے اس کے لائق فرزندوں نے کیوں ہزاروں
بے گناہوں کے خون بہائے۔ اس کا صرف ایک جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ
تحفظ حقوق کی خاطر ایسا کیا گیا۔ ورنہ سری کرشن جی جو ہندوؤں کے مصلح اعظم تھے کبھی
ارجن کو اشتعال دیکر قتل و غارت کا بازار گرم نہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
اشرف المخلوقات کی خونریزی تحفظ حقوق کے لئے ان افعال میں داخل ہے جس
کو عقل اور مذہب جائز جانتے ہیں۔ مادر ہند کے لائق فرزندو۔ پھر اسلام پر کیوں
اعتراض کرتے ہو جس نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے قانون دفاع بنایا۔ اگر
آپ کو کوئی خواہ مخواہ بازار میں مارنے لگے یا آپ کا مال لوٹنے لگے۔ تو کیا آپ
اس کو دفع نہ کریں گے؟ اور کیا آپ کے دفع کرنے کو مدبرین عالم بُرا سمجھیں گے؟
یہ ایک قانون فطرت ہے کہ ہر جاندار اپنی حفاظت کے لئے دشمن کی روک تھام
کرتا ہے۔ اگر کتا بلّی پر حملہ کرے تو بلّی اس کے دفع کرنے کی کوشش نہیں کرتی؟

کیا یوں ہی اس کا شکار بن جاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ وہ پوری طاقت سے اپنے دشمن کی مدافعت کرتی ہے۔ اور قانون عقل و فطرت کی رو سے اسے اس کا حق حاصل ہے جب جانور بھی جو قانون فطرت کے پابند ہیں اپنی حفاظت کے لئے پوری طاقت کے ساتھ دشمن کو دفع کرتے ہیں تو اشرف المخلوقات جس کی عقل نفع و ضرر کی کسوٹی ہے اپنے دشمن کے دفاع پر کب مذمت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اسلام کا قانون دفاع قانون فطرت کے مطابق ہے۔

اسلامی جہاد کے مقابلہ میں دوسری اقوام کے جہاد کو رکھ کر دیکھنے سے یہ اسلامی رواداری اور رحم و کرم کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ عیسائیوں کے جہاد کے خوفناک مناظر سے ظالموں کے بھی کلیجے لرز جاتے ہیں۔ حالانکہ مسیح کے نقش قدم پر چلنے والے اس نظریہ کے پابند ہیں "اگر کوئی تمہارے رخسارہ پر طمانچہ مارے تو تم دوسرے رخسار کو اس کی طرف کر دو"۔ عیسائیوں نے نہ صرف باہمی خونریزیاں کیں بلکہ یہودیوں کے خون کی ندیاں بہائیں۔ مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ تہ تیغ کیا۔ مارچ ۱۰۹۵ء میں پوپ اربن دوم نے پلاسینٹا میں ایک کونسل کی۔ اور اسی سال ماہ نومبر میں دوبارہ بمقام کلیر مونٹ کونسل منعقد کی۔ اس جگہ پوپ نے عیسائیوں کو جہاد کا حکم دیتے ہوئے کہا "ان کافروں سے جہاد کرو جو خداوند یسوع مسیح کی خانقاہ پر قابض ہو گئے ہیں۔ جو تم میں سے اس جہاد میں شامل ہوگا اس کے سارے پچھلے گناہ بخش دوں گا۔ اور جو مارا جائے گا اس کو بہشت میں جگہ دوں گا"۔ اس تقریر نے

کروسیڈروں پر ایسا اثر کیا کہ وہ مسلمانوں کی خونریزیوں کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے
یہ لوگ ایسے جوش میں آئے کہ حریف اور غیر حریف میں تمیز نہ کر سکے۔ مسلمانوں
کی بجائے ترکستان پر حملہ کرتے وقت راہ میں یہودیوں کو قتل کرنا شروع
کر دیا۔ کولون وغیرہ میں ہزاروں یہودی قتل ہوئے۔ ہزاروں لوٹے گئے۔
عیسائی جہاں بھی پہنچے لوٹ مار شروع کر دی۔ چنانچہ جب کروسیڈر یروشلم میں
پہنچے اور دھاوا کر کے اس کو فتح کر لیا۔ تو اپنی عادت کے موافق خونریزیاں کیں
میجاڈ صاحب اس کشت وخون کا مرقع یوں کھینچتے ہیں ”عرب بازاروں اور گھروں
میں تہ تیغ کئے گئے۔ مغلوبوں کے لئے کوئی جگہ یروشلم میں پناہ کی نہ رہی بعض
قتل کے خوف سے فصیلوں پر چڑھ گئے۔ بعض پناہ کے لئے محلوں، برجوں اور
مسجدوں میں گھس گئے۔ مگر وہ وہاں بھی اپنے آپ کو عیسائیوں کے تعاقب سے
نہ بچا سکے۔ کروسیڈروں نے مسجد عمر کو جہاں عربوں نے کسی قدر مقابلہ کیا
فتح کر کے پھر وہی کشت وخون شروع کر دیا۔ جس سے ٹیٹوس کی خوں ریزی
بھی ماند پڑ گئی۔ پیدل وسوار پناہ ڈھونڈنے والوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ فاتح
زندوں کا تعاقب کرنے کے لئے مُردوں کی پشتوں کو پامال کرتے ہوئے
بگ ٹٹ دوڑ رہے تھے۔ رائیمونڈ جس نے اس واقعہ ہوش ربا کو بچشم خود دیکھا
ہے لکھتا ہے۔ ”مسجد کی ڈیوڑھی میں گھٹنے گھٹنے خون بہہ رہا تھا۔ اور گھوڑوں کی
رکابوں تک پہنچتا تھا۔ یروشلم میں یہ ظلم ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ ۱۵ جون ۱۰۹۹ء

کو داخل ہوئے۔ قتل و غارت میں صرف اتنے عرصہ کا وقفہ ہوا جتنے عرصہ میں
کروسیڈروں نے فتح کا شکرانہ ادا کیا۔ مگر جب شکرانہ ختم ہو گیا تو پھر وہی نمونہ
حشر قائم ہوا۔ اب وہ تمام قیدی جو پہلے قتل سے بچ رہے تھے اور وہ تمام لوگ
جو زرفدیہ کے لالچ میں چھوڑ دئے گئے تھے۔ نہایت بیرحمی سے قتل کئے گئے
عربوں کو کوٹھوں اور برجوں سے پھینکا جاتا اور زندہ جلایا جاتا۔ تہ خانوں سے
کشاں کشاں لاکر تہ تیغ کیا جاتا۔ اور زندہ پکڑ کر پبلک جگہوں میں لایا جاتا۔ اور
مُردوں کی پشتوں پر قتل کیا جاتا۔ عورتوں کی آہ وزاری، بچوں کی چیخ و پکار،
اس جگہ کا نظارہ جہاں مسیحؑ نے اپنے قاتلوں کے گناہ کو بخشا تھا۔ فاتحوں کے غضب
کو کچھ بھی کم نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ شہر میں مرد، عورت، بچے، ستر ہزار قتل ہوئے"
یہ اُن لوگوں کے جہاد کا ہلکا سا خاکہ ہے جو دُنیا میں اپنے کو سب سے زیادہ
نرم دل کہتے ہیں۔ دُنیا میں صرف دو قومیں اپنے کو سب سے زیادہ رحم دل
کہتی ہیں۔ "(۱) ہندو (۲) عیسائی" میں نے دونوں کی ظالمانہ جنگوں کا نقشہ
پیش کیا۔ ان کے مقابلہ میں اسلامی جہاد کی رواداری۔ تمام اقوام عالم سے
ہمدردانہ سلوک، انسانی برادری سے مساوات کا اندازہ قرآن کی اس آیۃ
سے ہوتا ہے۔ "اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْهُ" یعنی اگر
کوئی کافر بھی پناہ مانگے تو اسے پناہ دیدو" اس سے صحیح فیصلہ ہو سکتا ہے
کہ اسلام جنگجو مذہب ہونے کی بجائے صلح و امن کا علمبردار ہے۔ جہانتک

تاریخوں کی اعانت کا تعلق ہے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ مُسلمان اس قانون سے ایک انچہ آگے بڑھے ہوں۔ مُسلمانوں نے ہمیشہ انتہائی متانت کے ساتھ اپنی بے نظیر قربانیاں پیش کرنے پر اظہار مسرت کیا۔ وہ قتل کرنے سے اس قدر خوش نہ ہوتے تھے۔ جس قدر قتل ہونے سے۔

چنانچہ شہید اعظم یعنی حسین علیہ السلام نے چند گھنٹوں کے اندر اپنی بے نظیر قربانیاں پیش کر کے دُنیا کے محققین کو پیغمبر اسلام کا صحیح نقطہ نظر اور اسلام کا حقیقی بتا دیا۔

رسول عربی کے قانون جہاد کا منشا یہ ہے کہ مُسلمانوں کے اندر لوٹ مار کے بجائے تحفظ حقوق کی خاطر جاں نثاریوں کا مادّہ پیدا ہو۔ کوئی منصف مزاج مورخ اس امر کو بتا سکتا ہے کہ اسلام نے ہندوؤں اور عیسائیوں کے بے دردانہ جہاد کی طرح اپنی جنگوں میں رواداری سے کام نہ لیا ہو"؟ نہیں اور ہرگز نہیں! تاریخوں کے صفحات برابر اس کا ثبوت دے رہے ہیں۔ کہ مسلمان اپنی جنگوں میں برابر ظالمانہ جد وجہد سے پرہیز کرتے رہے انہوں نے اپنے حریفوں کو غور کرنے کی مہلت بھی دی۔ ان سے ان کے مقاصد کی حقانیت پر استدلال بھی مانگے۔ جب حریفوں کی جنگجو طبیعتوں سے عاجز آ کر مُسلمانوں نے تلوار اٹھائی۔ اور خلوصیت کی علمبرداری کے ماتحت فتح کا جھنڈا گاڑا۔ تب بھی حریفوں کے اسیروں، عورتوں، اور بچوں کی خاص طور سے

نگہداشت کی۔ مسلمانوں نے ان کی سابقہ عزت کے خلاف تحریک کرنا جرم عظیم سمجھا۔ چنانچہ نوشیرواں کی پوتی کو جب قید کر کے دربار اسلامی میں لایا گیا تو اس کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا۔ جو ایک شاہزادی کے ساتھ کرنا چاہیے تھا اسے تمام اختیارات آزادی حاصل تھے۔ اس سے اسلامی جہاد کی رواداری کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔
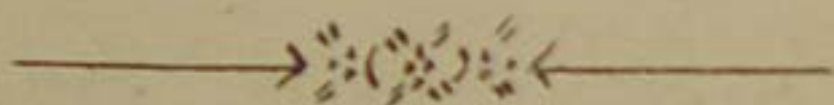
باب ۲۱

باآوازِ بلند عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جبکہ خداوند عالم دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے اور اگر اس کا سُننا زور زور سے پکارنے پر موقوف ہے تو وہ خدا کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ جو بلند آواز کا محتاج ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا
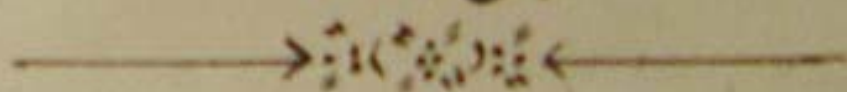
خداوند عالم ہر آواز کا عام اس سے کہ بلند ہو یا پست عالم ہے۔ وہ جس قدر زور سے پکارنے والے کی آواز سنتا ہے اسی قدر دل کی خاموش دُعا سے واقف ہے۔ سطح زمین پر رہنے والے اور طبقات ارض کے ماتحت سیر کرنے والوں کی آوازیں یکساں اس تک پہنچتی ہیں۔ نماز یا دوسری عبادتوں میں اگر آواز بلند نہ کی جائے۔ بلکہ دل خاموش وظیفہ پڑھتا رہے تب بھی اس کے علم میں کمی نہ ہوگی۔ اس لئے عابد کی باآواز بلند عبادت کا تعلق ذات احدیت

کی سماعت یا عدم سماعت سے نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جس کا سُننا آواز کی پستی و بلندی کا محتاج ہو وہ خدا کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا بلکہ باواز بُلند عبادت کرنے کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) یہ طے شدہ امر ہے کہ ذات احدیت حواس خمسہ ظاہری و باطنی سے بالاتر ہے۔ اس لئے عابد کا خیال عبادت کے وقت منتشر ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں بُلند عبادت کرنے والوں کا خیال ہمیشہ ان الفاظ کی طرف ہوتا ہے جو اس کے مُنہ سے ذات احدیت کی تعریف میں نکلتے ہیں۔

(۲) لفظ کا اثر قہراً نفس پر پڑتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص زید کو گالیاں دے یا جھوٹا الزام لگائے تو اس کے چہرے سے غصہ کے آثار نمایاں ہوں گے اور اگر کوئی شخص زید کی تعریف کرے تو اس کی پیشانی سے خوشی کے اثرات کا ظہور ہوگا۔ اگر لفظ کا اثر نفس پر نہ ہوتا تو کسی کے بُرا کہنے یا تعریف کرنے سے انسان اثر نہ لیتا۔ حالانکہ دُنیا میں فتنہ و فساد، ربط و ضبط، دوستی و دشمنی کا رشتہ لفظوں ہی سے مربوط ہے۔ انسان کا الفاظ سے متاثر ہونا ان بدیہیات میں سے ہے جس کا بیوقوف ترین شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت سے کون منکر ہو سکتا ہے کہ تمام نظامِ عالم کلی و جزی الفاظ پر موقوف ہے۔ اگر ساری دُنیا گونگی ہو جائے تو ایک منٹ میں نظام عالم اُلٹ جائے گا۔ جب ہر قسم کے الفاظ کا اثر نفس پر ہوتا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ان الفاظ کا نفس پر

اثر نہ ہو۔ مین کو عبادت کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اچھے الفاظ کا اچھا اور بُرے الفاظ کا بُرا اثر ہوتا ہے۔ دُنیا کا کوئی ایسا انسان نہیں عام اس سے کہ وہ کسی مذہب کا پابند ہو یا نہ ہو۔ جو عبادت کو اچھا نہ جانتا ہو۔ اس لئے بآواز بُلند عبادت کرنے سے نفطرتاً نفس کی پاکیزگی میں اضافہ ہونا ضروری ہے۔

(۳) تبلیغ کی دو صورتیں ہیں (۱) دوسرے کو مخاطب کر کے اچھے کام کی طرف رغبت دلانا۔ (۲) اپنے نفس سے بآواز بُلند مخاطبہ کر کے دوسروں کی توجہ کو نیکی کی طرف مبذول کرنا۔

دوسری تبلیغ پہلی تبلیغ کی بہ نسبت زیادہ موثر ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ نصیحتوں کو سُننا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے ناصح کے برخلاف فتنہ و فساد کرتے ہیں۔ لہذا تبلیغ کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اپنے نفس کو مخاطب کر کے دوسروں کو سُنائے۔ وضاحت کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ زید زکوٰۃ دینے کی تبلیغ کرتا ہے۔ اس کے خلاف زکوٰۃ نہ دینے والی پارٹیاں کھڑی ہو جائیں گی اور اس کے مواعظ کو بے اثر بنانے کی انتھک کوشش کریں گی۔ لیکن زید کے مقابل میں بکر کسی سے کچھ نہیں کہتا۔ البتہ زکوٰۃ نہ دینے والوں کے مجمع میں جاکر بالاعلان خود زکوٰت دیتا ہے۔ اس کی مخالفت میں کوئی پارٹی کھڑی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کی تبلیغ کا ظاہری رُخ اپنے نفس کی طرف تھا۔ نتیجہ میں وہ تمام پارٹیاں خود شرمندہ ہوں گی جو زکوٰۃ کے خلاف ہیں۔ اسی طرح بآواز بُلند

عبادت کا مقصد یہ ہے کہ عبادت نہ کرنے والوں کو تنبیہ ہو۔

(۴) جب تک باآواز بلند عبادت نہ کی جائے عبادت نہ کرنے والے کا صحیح منشا معلوم نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس کا پوزیشن خطرہ میں رہتا ہے۔ فرض کیجئے زید مسافرانہ حیثیت سے میرٹھ آئے جہاں مختلف مذاہب کے پابند آباد ہیں۔ یہاں زید کے مذہب سے کوئی واقف نہیں ہے۔ اس وقت اہل میرٹھ کی تمام سوسائٹیوں کا فطری فریضہ ہے کہ وہ زید سے اس وقت تک رازداری کی بات نہ کریں۔ جب تک کہ اس کا پوزیشن واضح نہ ہو جائے اگر زید اپنی عبادت کو صرف دلی خیالات سے ادا کر لیتا ہے۔ تو ہر سوسائٹی اس سے پرہیز کرنا ضروری سمجھے گی۔ کیونکہ ہندو یہ سمجھیں گے کہ زید مسلمان ہیں مسلمان سمجھیں گے کہ زید عیسائی ہے، عیسائی سمجھیں گے کہ زید یہودی ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان فرض کر لیا گیا۔ تو شیعہ سمجھیں گے کہ زید سُنی ہے سنی یہ سمجھیں گے کہ زید قادیانی ہے۔ قادیانی یہ سمجھیں گے کہ زید بابی ہے۔ یا اگر زید کو ہندو فرض کیا گیا تو ہندوؤں کے مختلف فرقے زید کو ایک دوسرے کی طرف منسوب کریں گے۔ آریہ اسے سناتن دھرم سمجھیں گے۔ سناتنی اسے جینی سمجھیں گے۔ غرض زید کا پوزیشن مسجد، مندر، گرجا، میں جانے کے باوجود بھی صاف نہیں ہوتا۔ لیکن اگر زید باآواز بلند عبادت کرے تو اہل میرٹھ کی ہر سوسائٹی کے نزدیک اس کا صحیح پوزیشن قایم ہوگا۔ پھر اس کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش

نہ رہے گی۔ آہستہ آہستہ عبادت کرنے والے کو یقین کے ساتھ خدا پرست
یا بُت پرست یا آتش پرست وغیرہ نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے اسلام نے
ہر شخص کی حیثیت اور شخصیت واضح کرنے کے لئے بآوازِ بلند عبادت کرنے کا
حکم دیا۔ تاکہ کوئی کسی کی طرف سے مشتبہ نہ ہو۔ عبادت کرنے والا بالاعلان
عبادت کرکے ان تمام شکوک کو رفع کرتا ہے جو تمدن میں خلل انداز ہو سکتے
ہیں۔

باب ۲۲

وضو و غسل و تیمم کے واجب ہونے کا فلسفہ

اسلام نے جہاں باطنی طہارت کے طریقہ تعلیم کئے وہاں ان اصول کو بھی بتایا جن کا تعلق طہارت جسمانی سے ہے۔ انسان حیوان ناطق کے مجموعہ کا نام ہے جیساکہ اہل منطق و فلسفہ نے تسلیم کیا ہے۔ اس لئے جس طرح اس کے لئے روح کی طہارت ضروری ہے تاکہ وہ باطنی بیماریوں سے محفوظ رہے۔ اسی طرح اس کے لئے جسم کی طہارت بھی ضروری ہے تاکہ وہ جسمانی امراض میں مبتلا نہ ہو۔ اسی بنا پر اسلام نے انسان کی جسمانی اور روحانی صحت کا مکمل انتظام کیا کیونکہ دنیاوی اور دینی ترقی انسانی صحت پر موقوف ہے۔ بیمار انسان نہ قومی خدمات کر سکتا ہے نہ اہل و عیال کی پرورش، نہ ظاہری عبادتیں بجا لاسکتا ہے نہ روحانی ریاضت۔ بلکہ مسلسل امراض میں مبتلا ہونے سے انسان کی موت بہتر ہے۔ اس لئے اسلام نے وضو و غسل کا قانون مقرر کر کے انسان کو پاکیزگی کی تعلیم دی۔ انسان اگرچہ نوع کے اعتبار سے واحد ہے لیکن عادات اور خصائل کے اعتبار سے مختلف الاقسام ہے۔ بعض بالطبع پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں بعض طہارت کا بالکل خیال نہیں کرتے

اگر اسلام وضو و غسل کا قانون مقرر نہ کرتا تو وہ لوگ جو طہارت کی اہمیت سے
ناواقف ہیں کبھی اس طرف متوجہ نہ ہوتے۔

(۲) پانی قدرتاً اکثر امراض کی دوا ہے۔ چاقو وغیرہ سے جلد پر جو زخم ہو جاتا
ہے اس پر پانی کا بھگویا ہوا کپڑا باندھا جاتا ہے جس سے اس کی صحت ہو جاتی
ہے۔ یوں تو یونانی فلاسفر بھی پانی سے اکثر مرضوں کا علاج کرتے تھے۔ لیکن جدید
تحقیقات کے ماہرین نے سائنٹفک طریقہ سے اس کے اصول مقرر کئے اور تمام
امراض کے لئے ہومیوپیتھک ۔ الوپیتھک، ویدک اور یونانی علاجوں
کی طرح اس کو بھی مستقل علاج تسلیم کیا۔ میرے ایک دوست ڈاکٹر نے مجھ سے ماہرین
علاج بالماء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ حال ہی میں ایک اندھے کو پانی کے ذریعے
علاج کر کے اچھا کیا گیا۔ اندھے کی آنکھوں میں نور واپس آگیا۔ اسی طرح ۱۹۳۳ء میں
میرے ایک دوست ڈپٹی انسپکٹر مدارس نے جو تقریباً ستر سال کا سن رکھتے تھے
فرمایا کہ مجھے آج تک نزلہ و زکام وغیرہ کی شکایت نہیں ہوئی بلکہ کبھی مجھے کوئی دماغی
مرض نہیں ہوا۔ کیونکہ میرا برابر یہ دستور رہا کہ صبح کو آدھے لوٹے کے قریب پانی ناک
کے ذریعہ دماغ تک پہنچاتا ہوں۔ اور حلق کے ذریعہ اس کو دفع کرتا ہوں۔ اس کی
وجہ سے میرے دماغ میں اس قدر طاقت ہے کہ ایک جوان انسان میری برابر
دماغی کام نہیں کر سکتا۔ غالباً اسی لئے وضو میں ناک کے اندر پانی ڈالنے کا
حکم اسلام نے دیا۔

(۳) پانی بدن کے ان مسامات سے میل دور کرتا ہے جو ہوا کی آمد و رفت کے دروازہ ہیں. اگر وہ مسامات بند ہو جائیں تو انسان کبھی تندرست نہیں رہ سکتا. اس لئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وضو و غسل انسانی صحت کے اعلیٰ ذریعے ہیں

(۴) پانی ان جراثیم کو دفع کرتا ہے جو بدن انسانی پر میل یا دیگر وجوہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ جراثیم بیماری کا سبب اعظم ہیں. اگر اسلام وضو و غسل کا قانون نہ بناتا تو بیماری کے جراثیم فنا کرنے کے لئے شریعت کے ماتحت کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ اس لئے اسلام نے اصول صحت کو اس قانون کے ماتحت منضبط کیا۔

(۵) جب انسان نہاتا ہے یا مونہہ ہاتھ دھوتا ہے تو وہ اپنے اندر سُبکی محسوس کرتا ہے. سُبکی کی یہ وجہ نہیں ہے کہ میل کی وزنی تعداد اس کے جسم سے کم ہوگئی. بلکہ صرف اس لئے کہ جسم کی پاکیزگی سے روح کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے روحانی اعمال کرنے والے لوگ ہمیشہ پاک و پاکیزہ رہتے ہیں. جب یہ قانون فطرت ہے کہ ظاہری طہارت باطنی طہارت کا زینہ ہے تو ہر اس مذہب کا جو حقانیت سے تعلق رکھتا ہے اور جسمانی و روحانی ترقی کا ذمہ دار ہے فریضہ ہے کہ وہ باطنی طہارت کے ساتھ بلکہ اس سے قبل ظاہری طہارت کا انتظام کرے۔ اسی وجہ سے اسلام نے نماز سے قبل وضو و غسل کو

واجب قرار دیا۔

تیمم کے واجب ہونے کا فلسفہ

یہاں ایک ظاہری شبہ یہ ہوتا ہے کہ وضو وغسل سے جسم کی صفائی ہوتی ہے لیکن تیمم سے جو خاک پر کیا جاتا ہے جسم کی صفائی ناممکن ہے۔ کیونکہ اس سے جسم پر صفائی کے بجائے میل جمع ہوتا ہے۔ اور وہ مسامات بھی بند ہو جاتے ہیں جن کا کھلنا صحت کا معیار ہے۔ آب وہوائے تازہ کے راستہ بند ہونے سے ظاہر ہے کہ جسم کے اخلاط اور اس کی اندرونی ہوا کس قدر جلد خراب ہو جائے گی۔ اس شبہ کا جواب بہت آسان ہے۔ ماہرین فلسفۂ طبعیات اور علمائے طبقات الارض کے نزدیک مٹی کے خواص اور فوائد دوسرے عناصر کی بہ نسبت بہت زیادہ ہیں کیونکہ انسان کے اجزائے ترکیبی میں یہ جزاعظم ہے۔ اہل سائنس کے نزدیک مٹی میں ان جراثیم کے فنا کرنے کی سب سے زیادہ طاقت ہے جو امراض کے پھیلنے کا سبب ہیں۔ اس باب میں انسان جانوروں کی ترقی سے کئی منزل پیچھے ہیں۔ آپ نے اکثر جانوروں کو مثلاً کبوتر، مرغ، گھوڑا، گدھا وغیرہ کو مٹی میں لوٹتے دیکھا ہوگا۔ جانور ایسا کیوں کرتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ مٹی سے جراثیم فنا کر کے اپنی صحت کی حفاظت کریں۔ اکثر شکاری اور مردار خوار پرندے اپنی نجاست آلود چونچ کو زہریلے جراثیم فنا کرنے کے لئے زمین پر رگڑتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور مٹی کے خواص سے فائدہ حاصل کرنے میں انسان سے آگے ہیں۔

کتے کے چاٹے ہوئے برتن کو مٹی سے پاک کرنے کا فلسفہ

دورِ حاضرہ میں اہلِ سائنس نے اِس امر کا بھی انکشاف کیا ہے کہ کتے کے لعابِ دہن سے جو مہلک جراثیم پیدا ہوتے ہیں وہ مٹی سے فنا ہو جاتے ہیں۔ آج جس امر کی تحقیق پر اہلِ سائنس کو ناز ہے۔ تیرہ سو برس پیشتر پیغمبر اسلام نے اس حقیقت کو واضح کیا تھا کہ جس برتن کو کتا چاٹ جائے۔ اس کو مٹی سے مانجھنا چاہیے۔ جب تک کتے کا چاٹا ہوا برتن مٹی سے نہ مانجھا جائے پاک نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ مٹی زخموں وغیرہ کے لئے پانی کی بہ نسبت کم مُفید نہیں۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تیمم کے ہونے میں وہی راز مضمر ہے جو وضو و غسل کے واجب ہونے میں ہے۔

باب ۲۳

استفسار

اس باب میں اُن خطوط میں سے چند کا ذکر کیا گیا ہے جو وقتاً فوقتاً اسلامی مشکل مسائل دریافت کرنے کی غرض سے خاکسار کے پاس آئے۔ گنہگار اِن حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہے جو عزت افزائی فرماتے رہے۔

نامہ گرامی جناب عمدۃ العلماء العارفین زبدۃ الفضلاء الکاملین حضرت مولانا مولوی سید ابوالحسن صاحب قبلہ از بمبئی

جناب مولوی قمرالزماں صاحب قبلہ مدظلہ العالی

سلام علیکم۔ میں خیریت سے ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ پچھلے عرصہ میں میری طبیعت علیل ہو گئی تھی۔ اب خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ آپ کو تحقیقات سے دلچسپی ہے اس لئے اُمید ہے کہ خیریت نامہ میں اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈال کر مجھے شکریہ کا موقع دیں گے۔" رسول اللہ کی مسلم حدیث ہے انا و علی من نور واحد (یعنی میں اور علی ایک نور سے ہیں) نور بسیط ہے

اور جو شے بسیط و مجرد ہوتی ہے اس کی تقسیم ناممکن ہے۔ پھر نور کے دو ٹکڑے کیوں کر ہوئے۔

(ابوالحسن مقیم بمبئی)

جواب

(حدیث انا و علی من نور واحد کا حل)

حبیب محترم جناب مولانا مولوی ابوالحسن صاحب قبلہ دام مجدہٗ

علیکم السلام۔ والا نامہ ملا عزت افزائی کا شکریہ۔ خدا آپ کو ہمیشہ اچھے رکھے۔ میری دلی دعا ہے کہ آپ کے چشمۂ علوم سے طلبہ علوم عربی و فارسی برابر سیراب ہوتے رہیں۔ میری پریشانیاں روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ اور پھر اس پر ضبط نفس۔ خیال ہے کہ دل و دماغ اپنی ذمہ داریوں سے قبل از وقت فارغ ہو جائیں گے اگر شرافت نفس مانع نہ ہوتی تو ایک ایک پریشانی کو گنواتا۔ حدیث کے متعلق یہ ہے کہ آپ مجھ سے بہتر حل کر سکتے ہیں۔ تاہم دوستوں اور بزرگوں کی فرمائش کو رد کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے عرض کرتا ہوں۔ نور کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) مجرّد (۲) مادی۔ نورِ مجرّد کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ لیکن نور مادی کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ ہر روحانی شے کا کوئی مظہر آثار ضرور ہوتا ہے۔ اعضائے انسانی روح انسانی کے مظہر آثار ہیں۔ اگر اعضائے انسانی میں حس و حرکت نہ ہو تو روح کی معرفت ناممکن ہے۔ خدائے واحد کے مظاہر آثار عمومی موجودات ہیں اور مظہر

خصوصی انبیاءؑ ہیں۔ اسی طرح نور مجرد کا مظہر نور مادی ہے۔ نور مجرد کو کسی نے نہیں دیکھا۔ نور مادی کو پیغمبر اسلام کے معاصرین نے دیکھا ہے۔ تاریکی میں آپ کی مبارک پیشانی سے نور کے ساطع ہونے پر آج تک تاریخیں شاہد ہیں۔ حقیقتاً اسی نور مادی کی تقسیم ہوئی۔ اس لئے نور مجرد کی تقسیم کے معنی یہ ہیں کہ پہلے اس کا تعلق ایک نور مادی سے تھا تقسیم ہونے کے بعد نور کے دونوں ٹکڑوں سے اس کا تعلق ہو گیا۔ اس کے علاوہ نور واحد کے معنی اصل واحد کے ہیں یعنی میں اور علی ایک اصل سے ہیں۔ قوت کمالیہ جو مدار نیابت الٰہی ہے۔ دونوں میں ایک ہے۔ یہی اصل اصول ہے۔ جو روح اعظم نبوتی و اماتی میں پایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قمر الزماں سبزداری

نامہ گرامی عالیجناب فخر قوم جناب سید شمشاد حسین صاحب دام مجدہٗ بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔ وکیل میرٹھ

حضرت مولانا قمر الزماں صاحب قبلہ دام ظلہٗ العالی

سلام علیکم۔ مزاج مبارک۔ اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ برائے مہربانی امور ذیل پر روشنی ڈال کر خادم کو شکریہ کا موقع عنایت فرمایئے۔ اور کار لاائقہ

سے مطلع فرماتے رہا کیجئے۔

(۱) جبکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ انسان کے لئے ہر چیز پہلے سے مقدر کر دی گئی ہے۔ وہ اپنے افعال میں اپنی تقدیر کا پابند ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے وہ ہی ہوتا ہے جو قضا و قدر نے اس کے لئے مقدر کر دیا تھا وہ اس حکم ازلی کے خلاف کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ لہذا ایسی مجبوری و بےچارگی کی حالت میں انسان کو اچھے اور برے افعال کا ذمہ دار قرار دینا اور اس پر جزا و سزا کا مرتب کرنا خلاف انصاف ہے۔ کیونکہ اس نے جو فعل کیا وہ درحقیقت اس کی مجبوری کا نتیجہ تھا۔

(۲) جس طرح انسان سے عمل خیر ظہور میں آتا ہے اسی طرح جذبات و حواس خمسہ کے ماتحت اس سے عمل شر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ہر دو اعمال کا مختار و ذمہ دار وہ ہی انسان ہے۔ ایسی حالت میں نیکی کا خدا کی طرف اور برائی کا بندہ کی جانب منسوب کرنا مسئلہ میں پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے۔

ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ جو مقدر میں تھا وہ ہوا۔ اس سے انسان کی مجبوری معلوم ہوتی ہے جیسا کہ میں سوال نمبر ۱ میں توضیح کر چکا ہوں، دوسری طرف جو بدی سرزد ہوتی ہے اس کا ذمہ دار بندہ قرار دیا جاتا ہے۔

(۳) اعتقاد کو علیحدہ رکھتے ہوئے یہ زیادہ مناسب اور قرین عقل و تجربہ ہے کہ خیر و شر دونوں کا ذمہ دار انسان خود ہی ہے۔ اگر وہ کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اس کا اجر اس کو بصورت بہشت ملے گا۔ اور اگر برا کام کرتا ہے تو اس کی سزا ملے گی۔

اگر یہ صحیح ہے کہ نیکی خدا کی طرف سے ہے تو پھر بندہ کو اس کا اجر کیوں ملے گا۔ کیونکہ جب ایک شے خدا کی طرف سے ہے تو فاعل مجبور اجر کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ آج کل کے قانون میں دیکھ لیجئے۔ ایک شخص کو برا کام کرنے پر سزا ہوتی ہے اور نیک کام کرنے پر خطابات ملتے ہیں۔ کیونکہ گورنمنٹ کی نظر میں دونوں کام انسان ہی کے اختیارات کلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ والسلام

شمشاد حسین میرٹھ

جواب

مسئلہ تقدیر و خیر و شر کا حل

مکرمی و معظمی مدظلہ العالی علیکم السلام

والا نامہ پہنچا۔ عزت افزائی فرمائی۔ آپ کے تینوں سوالوں کا حل اسی ترتیب سے لکھکر روانہ کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کارلائقہ کے ذریعہ خادم کو یاد فرماتے رہیں گے۔

(۱) یہ سچ ہے کہ ہر انسان اپنے افعال میں تقدیر کا پابند ہے۔ وہ اپنے ازلی مقدر سے نہ ایک انچ آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ لیکن لفظ تقدیر و مقدر توضیح طلب ہیں۔ مقدر تقدیر سے مشتق ہے۔ اس لئے جو تقدیر کے معنی ہوں گے وہی مقدر کے۔ تقدیر قدر سے بنا ہے جس کے معنی اندازہ کے ہیں۔ کسی شخص کی تقدیر یا مقدر کے یہ معنی ہیں کہ اس کے لئے خدا کا ایک اندازہ

پہلے سے مقرر ہو چکا ہے۔ یہاں اندازہ کے معنی تخمینہ کے نہیں ہیں جیسا کہ ہم اپنے محاورات میں استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ علم کے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ خداوند عالم کا علم ازلی تقدیر انسانی کہلاتا ہے۔ جو اس کے علم میں آچکا وہ ضرور ہوگا۔ اگر زید کی تقدیر میں لکھا ہے کہ وہ چوری کرے گا تو اس کے خلاف نہ ہوگا۔ یعنی اگر علم الٰہی میں یہ گزر چکا ہے کہ زید نقب زنی کریگا تو اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے۔ کیا خدا کے علم نے زید کو چوری کرنے پر مجبور کر دیا؟ یا زید کا زمانہ مستقبل میں چوری کرنا علم الٰہی کا سبب ہوا؟ اس کی وضاحت کے لئے یہ مثال پیش کرتا ہوں کہ آپ نے بکر کو جو بحیثیت موکل مدعی یا مدعا علیہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بتایا کہ تم کل مقدمہ ہار جاؤ گے۔ بکر مقدمہ ہار گیا۔ اب قابل دریافت یہ امر ہے کہ آپ کے علم نے بکر کو مقدمہ میں ہرا دیا یا مقدمہ کے آثار سے آپ کو اس کے ہارنے کا علم ہوا۔ آپ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ غالباً ناواقف علم بھی یہ نہ کہے گا کہ آپ کے قبل از وقت علم نے بکر کو مقدمہ میں ہرا دیا۔ اگر کسی وکیل کا پہلے سے فیصلہ کے متعلق حکم لگانا اس امر کا باعث ہوتا تو کبھی اس وکیل کی تعریف نہ کرتے جو مقدمہ کے ہارنے کا حکم لگا رہا ہے۔ بلکہ اس سے متنفر ہوتے۔ حالانکہ یہ تجربہ ہے کہ لوگ ایسے وکلا کی دور اندیشی کے زیادہ معتقد ہوتے ہیں۔

یا کوئی نجومی زائچہ سے یہ بتائے کہ کل زید مر جائے گا۔ اور زید مر بھی جائے

تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نجومی کے علم نے زید کو فنا کر دیا؟ کیا زید کے ورثار
کو عدالت میں دعویٰ دائر کرنے کا حق ہے کہ نجومی کے علم نے زید کو مار دیا؟ کیا
آپ زید کے ورثار کو قانونی مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ نجومی کے برخلاف
استغاثہ پیش کرسکیں۔ کوئی بیرسٹر وکیل دُنیا کی کسی عدالت سے زید کے ورثار
کو مقدمہ جِتا سکتا ہے۔ وکیلوں، حکیموں، ڈاکٹروں، نجومیوں
وغیرہ کی اکثر پیشین گوئیاں صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ کوئی ایسی نظیر ہے کہ دُنیا کی
کسی گورنمنٹ کے سامنے اس قسم کا مقدمہ پیش ہوا ہو۔ آپ غالباً سب کا جواب
نفی میں دیں گے کیونکہ قبل از وقت کسی شے کا علم اس کے وجود کا سبب
نہیں ہوتا۔ بلکہ خود زمانہ مستقبل میں اس شے کا وجود پیشین گوئی کرنے والے کے
علم کا سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کا علم ازلی زید کے افعال بد و نیک کرنیکا
سبب نہیں ہے۔ بلکہ زمانہ مستقبل میں ہونے والے واقعات کے لئے اس کا علم
آئینہ ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس سے زیادہ تقدیر کے معنی نہیں ہیں۔ یہ
عوام النّاس کی غلط فہمی ہے کہ وہ تقدیر و مقدر کو جبر کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔
اگر خدا کا علم انسان کو اس کے افعال پر مجبور کرتا۔ یا وہ پہلے سے ہر شخص کیلئے
ایک فعل بطور جبر و قہر مقرر کرتا۔ اور یہ صحیح ہوتا کہ جو جس کی قسمت میں لکھا ہے وہ
مجبوراً ضرور ہوگا۔ تو دُنیا کے رہنمائے اعظم یعنی پیغمبر اسلام تبلیغی جدوجہد نہ کرتے
اور علی باغوں میں جاکر مزدور پارٹی کے دوش بدوش مصروف کار نہ ہوتے۔ اس

بنا پر پیغمبر اسلام کا وعظ، تمدن کی تعلیم، علوم و فنون کی ترویج، حریفوں سے نبرد آزمائی بے کار ہو جائے گی۔ کیونکہ جس کی تقدیر میں ایمان لانا تھا وہ بغیر وعظ کے بھی ایمان لاتا۔ جس کی تقدیر میں مشرک بننا تھا وہ ہر صورت میں مشرک بنتا۔ جس کی تقدیر میں بھوکا مرنا تھا وہ ہر صورت میں بھوکا مرتا۔ جس کی تقدیر میں ریاست تھی وہ رئیس ہوتا پھر رسول نے دُنیا کی ترقی میں عبث کوششیں کیں؟ حالانکہ دنیا کے مدبرین و محققین پیغمبر اسلام و علی اور دیگر اسلامی و غیر اسلامی رہنماؤں کی کوششوں کو بنظر استحسان دیکھتے ہوئے ان کے ممنون احسان ہوتے ہیں۔

پیغمبر اسلام کی تبلیغی جد و جہد اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ انسان کی ترقی و تنزل، خیر و شر اسی کے با اختیار ہاتھوں میں ہیں۔ میرے خیال ناقص میں مسئلہ تقدیر کے متعلق دلیلوں اور گزشتہ رہنماؤں کی مثالوں کی بھی ضرورت نہیں ہے ہر شخص بذات خود تجربہ کر کے فیصلہ کر سکتا ہے۔ آپ اپنے موکلوں کو واپس کر دیجیے مقدمات کو ہاتھ میں نہ لیجیے۔ عدالت میں نہ جائیے پھر اپنی آمدنی کو ملاحظہ کیجیے، سابقہ آمدنی سے کس قدر کم ہوتی ہے۔ اگر آمدنی کم نہ ہو تو سمجھ لیجیے کہ پہلے سے قدرتی تعین ہے ورنہ اس کی کمی و زیادتی انسان کے اختیارات کی طرف عائد ہوتی ہے۔ یقیناً ایسا کرنے سے آپ کی آمدنی کم ہوگی۔ اس لئے یہ ماننا ہوگا کہ خدا کی طرف سے کسی قسم کی کمی و زیادتی قہری و جبریہ طور پر نہیں ہے۔

(۲) اس میں شک نہیں۔ خیر و شر کا صدور انسانی جذبات اور حواس خمسہ کے

با قیمت ہوتا ہے۔ اس لئے وہی ان افعال کا ذمہ دار ہو سکتا ہے جو اس باب میں مختار تھا۔ رہا یہ امر کہ نیکی کی نسبت خدا کی طرف کی جاتی ہے اور برائی کی نسبت انسان کی طرف۔ اس کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ خیر و شر دونوں کا فاعل انسان ہے۔ اس لئے دونوں کی نسبت انسان کی طرف مساوی ہے۔ لہذا خدا کی طرف نیکی کی نسبت کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ حسب استعداد توفیق عطا کرتا ہے۔

(۳) نیکی و بدی دونوں کا ذمہ دار انسان ہے کیونکہ اس نے اپنے اختیار سے دونوں کو انجام دیا ہے۔ جو قرین عقل و تجربہ ہے۔ یہی ہمارا عقیدہ ہے اس لئے اعتقاد کو علیحدہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر اس کو صحیح مان لیا جائے کہ نیکی خدا کی طرف سے بطور جبر ہے تو بیشک نیکی کرنے والا مستحق بہشت نہیں ہو سکتا لیکن میں نمبر ۲ میں واضح کر چکا ہوں کہ خدا کی طرف نیکی کی نسبت کے صرف یہ معنی ہیں کہ وہ توفیق خیر عطا کرتا ہے۔ اور توفیق فاعل کو مجبور نہیں کرتی۔ ہاں اعانت ضرور کرتی ہے۔ اگر کوئی اُستاد اپنے شاگرد کی تعلیم میں اعانت کرے اور وہ پاس ہو جائے تو کیا اُستاد اس کو انعام نہ دے گا؟ یقیناً اُستاد اس کو انعام دے گا۔ کیونکہ اعانت نے شاگرد کے اختیارات کو سلب نہیں کیا۔ اس کے لئے ممکن تھا کہ محنت نہ کرتا جیسا کہ روزمرہ کا تجربہ ہے۔ استادوں کی تعلیمی و مالی اعانت کے باوجود طلبہ محنت نہ کرنے کی وجہ سے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ ماننا ہوگا کہ انسان خیر و شر میں بالکل آزاد ہے۔ والسلام۔ قمر الزماں سبزواری

نامہ گرامی عالیجناب فیض مآب جناب عبد اللہ خاں صاحب بالقابہ حنفی رئیس پنجاب

جناب قبلہ السلام علیکم ۔ مزاج مبارک ۔

آپ کو یہ معلوم ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے جب علمائے اسلام احادیث و دیگر منقولات سے مسلمانوں کو تسکین دیتے تھے ۔ میں بھی ان مسلمانوں کی ایک فرد ہوں جو تحقیق و استدلال پر سر نیاز خم کرتے ہیں ۔ میں اس مسئلہ پر ایک مدت سے غور کر رہا ہوں کہ مسلمانوں کے ایک سمجھدار گروہ میں مردہ پر تلقین پڑھی جاتی ہے اس میں دو امر قابل دریافت ہیں ۔

(۱) انسان مرنے کے بعد جمادات کی شکل ہو جاتا ہے ۔ اس لئے تلقین پڑھنے سے کیا فائدہ ۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مردہ ہماری بات کا جواب نہیں دیتا ۔ تو یہ کیونکر سمجھیں کہ وہ توحید وغیرہ کا اقرار جو ہمارے منہ سے نکلا ہے سمجھ لیگا ۔

(۲) اکثر ایسے آدمی مرتے ہیں جو جاہل محض ہوتے ہیں یا صرف اردو یا انگریزی وغیرہ کے عالم ہوتے ہیں ۔ لیکن عربی سے نابلد ہوتے ہیں ۔ پھر مرنے کے بعد وہ عربی کی تلقین کو کیونکر سمجھ جاتے ہیں ۔ مرتے وقت عربی کی ابجد سے واقف نہیں اور مرتے ہی عربی کی تلقین کو سمجھ گئے ۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ۔ برائے مہربانی اس کا جواب دیکر بندہ کو ممنون فرمائیے ۔

(آپ کا دعاگو ۔ عبد اللہ خاں)

جواب

مسئلہ تلقین کا حل

محترمی۔ علیکم السلام

مزاج مبارک۔ گرامی نامہ آیا۔ یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے مردہ پر تلقین پڑھنے کے متعلق دو سوال فرمائے ہیں۔ پہلے سوال کے متعلق تو یہ ہے کہ اس پر کوئی قطعی دلیل نہیں کہ انسان مرنے کے بعد جمادات کی مثل ہو جاتا ہے نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مردہ ہماری بات نہیں سنتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ہماری بات سنتا ہو۔ لیکن جواب دینے پر قادر نہ ہو۔

بولنا اور سننا دونوں علیحدہ چیزیں ہیں۔ اگر کوئی شخص نہ بول سکے تو اس کا یقین نہیں ہو سکتا کہ یہ سننے پر بھی قادر نہیں ہے۔ بہت آدمی ایسے ہیں۔ جو زبان سے بول نہیں سکتے مگر تمام باتیں سنتے ہیں جیسے گونگے۔ اسی طرح بہرہ بول سکتا ہے لیکن سن نہیں سکتا۔ مرگی کے بعض اقسام ایسے ہیں جن میں مریض سنتا ہے لیکن بول نہیں سکتا۔ اس لئے مردہ کا نہ بولنا ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ سننے سے عاجز ہے۔ حال ہی میں چند ایسے انکشاف ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مردہ میں سننے کی قوت باقی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ہارٹن اپنی ایک کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ آسٹریا میں ایک عورت مر گئی اور اس کے

جسم کو پانچ روز تک کسی قسم کی حرکت نہ ہوئی۔ دفن کرنے سے ایک روز پیشتر رات کے وقت جشن منانے کے لئے ایک گروہ جمع ہوا۔ یکلخت وہ عورت اٹھ بیٹھی سب لوگ دہشت کھا کر بھاگ گئے۔ دوسرے روز جب عورت بالکل اچھے ہو گئی اور لوگوں نے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میں ساری باتیں سنتی تھی لیکن حرکت کرنے سے معذور تھی۔ پروفیسر ہارٹمین کا بیان ہے کہ شہر آرلینس میں جب قاتل لانگل کا سر دھڑ سے علیحدہ کیا گیا۔ تو ڈاکٹر نے لاش پر نام لیکر پکارا اس نے آواز سنتے ہی آنکھ کھول دی۔

پروفیسر ہارٹمین کہتے ہیں کہ موت کے بعد کچھ دیر تک زندگی کا قائم رہنا ممکنات سے ہے۔ ہندوستان میں بھی اس قسم کے واقعات پیش آئے۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے بیان کیا کہ ہمارے وطن میں جب وہ عورت اچھی ہوئی جس کو مردہ تصور کیا گیا تھا۔ تو اس نے بیان کیا کہ میں تمام آوازیں سنتی تھی۔ لیکن میری گفتگو تم تک نہیں پہنچتی تھی۔ اس کے علاوہ روح کا جسم سے تعلق تدبیر و تصرّف کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ مرنے کے معنی یہ ہیں کہ روح کا وہ تعلق باقی نہیں رہا۔ لیکن اس پر کیا دلیل ہے کہ روح کا تعلق بالکل منقطع ہو گیا۔ ممکن ہے کہ مرنے کے بعد روح و جسم کا ضعیف تعلق باقی رہے۔

پھر یہ امر بھی قابل نظر انداز نہیں ہے کہ مبدء ادراک ظاہری و باطنی روح ہے جو دیکھنے میں آنکھوں کی اور سننے میں کانوں کی محتاج نہیں۔ اس لئے تلقین کا

ادراک کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔

دوسرے سوال کا جواب اس سے زیادہ واضح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر مرنے والے عربی سے ناواقف محض ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بتدریج علوم میں ترقی کرنا اور عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی کی تحصیل روح کے لئے اس وقت تک ہے کہ وہ جسم سے تعلق رکھتی ہو۔ اور جب مادیات کے تعلق سے پاک ہوگئی تو پھر اس کو کسی علم کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمام علوم اس کے لئے خود بخود حاصل ہیں۔ اس کی کھلی ہوئی مثال عالم خواب ہے۔ کیا آپ نے آج تک کسی آدمی کو یہ شکایت کرتے سُنا کہ میں نے خواب میں فلاں شخص سے ملاقات کی لیکن وہ انگریز یا عرب تھا اس لئے وہ نہ میری باتیں سمجھ سکا نہ میں اس کی باتیں؟ کبھی نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوست پنجابی ہے دوسرا یو، پی کا باشندہ یا ایک ہندوستانی ہے دوسرا انگریز لیکن خواب میں آکر سب کی زبان ایک ہوجاتی ہے۔ خواب میں روح کو ادنیٰ تجرد حاصل ہوتا ہے جس سے وہ تمام زبانوں کو سمجھتی ہے اور ان میں کلام کرتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جب روح کو اعلیٰ تجرد حاصل ہوگا تو اس کی زبان دانی کس حد تک ہوگی؟"

اُمید ہے کہ آپ خط وکتابت سے حقیر کو یاد فرماتے رہیں گے۔ کار لائقہ سے مطلع فرماتے رہیے۔ والسلام

دعاگو

قمرالزماں سبزواری

نامۂ گرامی جناب عمدۃ العارفین ڈاکٹر محمد عطا صاحب مدظلہ حنفی بالقابہ

جناب مولوی قمر الزماں صاحب قبلہ

السلام علیکم۔ بعد ادائے سنت اسلام عرض ہے کہ مسئلہ غیبت مسیحؑ و مہدیؑ ایک مدت سے میرے زیر بحث ہیں۔ جناب مسیح اور مہدی کے آج تک زندہ رہنے سے مخلوق کو کیا فائدہ ہوا۔ کیا وہ اب تک معطل رہے؟ اس سوال کا صحیح جواب نہ مل سکا۔ اگرچہ مورخین اور محدثین نے توجیہات بیان کی ہیں۔ تاہم ایک عقل سلیم کو اب بھی تامل کی گنجائش ہے۔

اُمید ہے کہ آپ کسی واضح مثال یا دلیل سے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائینگے۔

خاکسار۔ عطا

جواب

مسیحؑ و مہدیؑ کی غیبت کا حل

جناب محترمی ڈاکٹر صاحب دام ظلہٗ العالی

علیکم السلام۔ مزاج مبارک۔ اُمید ہے کہ آپ معہ متعلقین خیریت سے ہونگے مجھے ایک دوست سے آپ کے صاحبزادے کی علالت کا حال معلوم ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد انتقال کی خبر سُنی مجھے اتنا ہی افسوس ہوا جتنا ایک عزیز

کے لئے ہونا چاہیے۔ جناب نے مسیح و مہدی کی غیبت کے فائدے کو جو دریافت فرمایا اس کے متعلق یہ ہے کہ نبی اور امام کے دو فریضہ ہوتے ہیں (۱) وہ فریضہ جس سے اس کی ذات کا تعلق ہوتا ہے جیسے نماز و روزہ اور دیگر احکام الٰہی کی پابندی (۲) وہ فریضہ جس کا تعلق مخلوق سے ہو جس کا نام تبلیغ ہے۔ اگر بالفرض کوئی نبی کسی مصلحت یا مجبوری سے دوسرے فریضہ کو ادا نہ کر سکے تو اس کو معطل نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ پہلے فریضہ کو بدرجہ اتم انجام دے رہا ہے۔ اگر مسیحؑ و مہدیؑ کو تبلیغ ظاہری نہ کرنے سے معطل سمجھا جا سکتا ہے تو پیغمبر اسلام کی چالیس سال کی زندگی کے متعلق آپ کیا کہیں گے۔ یہ مسلم ہے کہ آپ نے چالیس برس کے بعد تبلیغ کی۔ کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ پیغمبر اس وقت تک نبی نہ تھے ورنہ اس حدیث کنت نبیا وکلا آدم بین الماء والطین میں اس وقت نبی تھا جبکہ آدم کا مجسمہ تیار نہیں ہوا تھا۔ کے خلاف ہوگا۔ اسی طرح ہر نبی کو کچھ زمانہ ضرور ایسا ملا ہے جس میں اسے خاموش رہنا پڑا ہے۔ مذہب سے قطع نظر کرتے ہوئے سیاسی لیڈروں کا بھی یہی دستور ہے۔ جب دیکھا کہ ظلم و تعدی کا ہاتھ خلل انداز انسانیت ہے تو اس کے دفع کرنے کے لئے پبلک کے سامنے آئے اور جب اپنے دخل نہ دینے سے عالم میں خلل نہ سمجھا خاموش رہے۔

ملک میں جب فتنہ و فساد زیادہ ہوتا ہے تو گورنمنٹ اپنے خصوصی حاکم بھیجکر اس کو رفع کردیتی ہے۔ اور جب ایسی صورت نہیں دیکھتی تو اپنے خصوصی حاکم نہیں

بھیجتی۔ اسی طرح جب دُنیا ظلم سے پر ہوجائے گی۔ اور کچھ خالص اطاعت کرنے والے پیدا ہوجائیں گے تو مسیحؑ و مہدیؑ ظاہری تبلیغ کے فریضہ کو انجام دیں گے

زمانۂ غیبت میں ان کے وجود سے ہمیں کیا فائدہ؟ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ تبلیغ دو قسم کی ہوتی ہے۔ لفظی اور خاموش۔ اگر ہر مبلغ کے زمانہ حیات کا زمانۂ تبلیغ لفظی سے توازن کیا جائے تو غالباً زمانہ تبلیغ لفظی بہت کم ہوگا۔ رات دن کے ۲۴ گھنٹوں میں سے مشکل سے آٹھ گھنٹہ ایسے ہوں گے جس میں اس نے اپنی زبان سے تبلیغ کی ہو۔

آپ نے کلکٹر، کمشنر، گورنر کو یہ نہ دیکھا ہوگا کہ وہ ہر وقت تلوار لئے رعایا کو احکام کے پابند بناتے ہوں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شہر میں کلکٹر کا وجود، کمشنری میں کمشنر کا موجود رہنا ہی تمام رعایا کے لئے بڑا وعظ ہے۔ اگر اہل شہر کو یہ معلوم ہوجائے کہ ہمارا کوئی افسر نہیں ہے تو فتنہ و فساد برپا ہوجائے۔ لیکن صرف اس علم سے کہ کلکٹر موجود ہے تمام رعایا مرعوب رہکر گورنمنٹ کے احکام کی پابندی کرتی ہے یا یوں سمجھئے کہ کالج کے شریر طلبہ محض اس علم سے کہ ہمارا پرنسپل موجود ہے۔ اپنی شرارتوں سے رُکے رہتے ہیں۔ اگر انہیں یہ یقین ہوجائے کہ کوئی پرنسپل نہیں ہے تو اپنی طبعی شرارتوں سے کالج کی عمارت کو درہم و برہم کردیں۔ جب تک کالج کے طلبہ کے ذہن میں یہ خیال رہے گا کہ ہمارا پرنسپل موجود ہے عام اس سے کہ وہ اس کو دیکھیں یا نہ دیکھیں شرارت نہیں کر سکتے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ پرنسپل و کلکٹر و

کمشنر کا وجود ہی طلبہ و رعایا کے لئے تبلیغ اعظم ہے۔ اسی طرح مسیحؑ و مہدیؑ کا وجود اگرچہ دنیا والے انہیں نہ دیکھیں عالم والوں کے لئے تبلیغ اعظم ہے

یہ جوابات وہ ہیں جن کو عام علمائے تحقیق پیش کرتے ہیں۔ لیکن خاکسار کی ذاتی رائے یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اس حقیقت کو جو مدارِ حیات نوعی بلکہ علّتِ حیاتِ جنسی ہے۔ موجود ہونا چاہیے تاکہ مبدءِ فیاض کی جانب سے اس کے ذریعہ تمام کائنات عالم پر فیضان ہوتا رہے۔ عام اس سے کہ وہ پوشیدہ ہو یا ظاہر۔ جیسے درخت کی جڑ کہ وہ مدارِ حیات نباتی ہے اس لئے پوشیدگی اور ظہور میں نباتات کے لئے یکساں مفید ہے۔ اسی طرح مرکزِ حیات بہر صورت کائنات عالم کے لئے مفید زندگی ہے۔

خاکسار

قمر الزماں سبزواری

نامۂ گرامی عالی جناب مولوی تصدق حسین صاحب فاضل امروہہ ضلع مُرادآباد

حضرت سرکار علّامہ اُستاذی المعظم مولوی قمر الزماں صاحب قبلہ دامت برکاتہ'

پس از سلام مسنون الاسلام آنکہ حقیر خیریت سے ہے۔ اور جناب والا کی خیریت کا طالب ہے۔ خادم جناب والا کو چند سوالوں کے جوابوں کی تکلیف دیتا ہے ایک

عرصہ سے یہ شبہ میرے ذہن میں گھوم رہے ہیں۔ جب سے فلسفہ پڑھا اس وقت سے ان گتھیوں کے سلجھانے کی فکر بڑھ گئی۔ اُمید ہے کہ آپ میرے تصدعہ کو معاف فرمائیں گے۔

(۱) جب انسان مر جاتا ہے تو معدوم ہو جاتا ہے۔ اور اہل فلسفہ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اعادہ معدوم محال ہے۔ اس لئے قیامت کا ہونا بھی ناممکن ہے۔

(۲) اسلامی عقیدہ کی رو سے رسول کریم کے جسم عنصری کا آسمان پر جانا تسلیم ہے۔ لیکن اہل فلسفہ کا یہ مسلمہ مقولہ ہے کہ آسمان میں خرق والتیام ناممکن ہے جب آسمان میں شگاف نہیں ہو سکتا تو رسول کا جسم عنصری نویں آسمان تک کیونکر پہنچا۔

(۳) جب ہر نماز کے لئے وضو کی ضرورت ہے۔ بغیر وضو کے نماز نہیں ہو سکتی تو نماز میت بغیر وضو کے کیونکر ہو سکتی ہے۔ حالانکہ فقہ کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ نماز میت بغیر وضو کے صحیح ہے۔

(۴) ایک سورۃ یا ایک آیتہ کو قرآن کس طرح کہہ سکتے ہیں جبکہ سورۃ اور آیت قرآن کا جز ہیں۔ زید ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک اور مخصوص علامات کا مجموعہ ہے۔ کیا فقط ہاتھ کو زید کہہ سکتے ہیں۔ یہ بدیہی امر ہے کہ زید فقط ہاتھ یا فقط پیروں کو نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ نام کل کا ہے اس لئے اس کے جُز پر صادق نہیں آسکتا یہ ہی حالت قرآن کی ہونی چاہیے۔

(۵) ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں ان سے نہ گناہ کبیرہ سرزد ہو سکتا ہے نہ گناہ صغیرہ۔ مگر قرآن بتاتا ہے کہ پیغمبر اسلام سے گناہ سرزد ہوئے۔ اور خدا نے انہیں معاف فرمایا۔ سورۂ فتح۔ انا فتحنا لک فتحا مبینا۔ لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر۔ یعنی اے رسول ہم نے تمہیں واضح فتح دی تاکہ خدا تمہارے گزشتہ اور آیندہ گناہ بخشدے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ رسول سے گناہ سرزد ہوئے اور آیندہ ہوتے جن کو خدا نے معاف فرمادیا۔

(۶) ذیل کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول قرآن کے نازل ہونے سے قبل غافل تھے حالانکہ حدیث ہے کنت نبیا و لا آدم بین الماء والطین۔ یعنی میں اس وقت نبی تھا جبکہ آدم کا پتلا تیار نہیں ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی قرآن کے نازل ہونے سے قبل غافل نہ تھے۔

نحن نقص علیک احسن القصص بما اوحینا الیک ھذا القرآن وان کنت من قبلہ لمن الغافلین۔ اے رسول ہم قرآن کے ذریعہ جو تم پر بطور وحی نازل کیا گیا ہے تمہیں بہترین قصہ سنائیں گے۔ اگرچہ تم اس سے قبل غافل تھے۔

(۷) فعصیٰ آدم ربہ فغویٰ (آدم نے اپنے رب سے سرکشی کی۔ اس لئے گمراہ ہو گئے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب آدم نے گناہ کیا۔ حالانکہ انبیاء علیہم السّلام کو معصوم

کہا جاتا ہے۔

آپ کا کفش بردار۔ تصدق حسین نقوی امروہوی

جواب

مسئلہ اعادہ معدوم و معراج اور بعض آیات قرآنی کا حل

استاد نواز۔ دعائے ترقی مدارج

خدا آپ کو خیریت سے رکھے۔ آپ کے سوالوں کے جواب اِن ہی نمبر دِں کے مطابق لکھتا ہوں۔ اگر کوئی جواب پسند خاطر نہ ہو تو تردید فرما دیجئے گا میں دوبارہ اس کی وضاحت کی کوشش کروں گا۔ سوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قرآن کو اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح ایک محقق کو پڑھنا چاہیئے۔ ورنہ آج کل تو زبان بسم اللہ کہتی ہے اور دل ختم قرآن کی نیت کرتا ہے۔ اسی لیئے لوگوں نے قرآن کو اپنی خود غرضیوں کا آلہ بنالیا ہے۔ خیر ہمیں کسی کی کیا حرص۔ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

(۱) عزیزم فلسفیوں کے مسلّمات پر اعتماد کرنا اصولی غلطی ہے۔ کیونکہ ان کے ہزاروں نظریہ باہم متناقض ہیں۔ دن رات کا مشاہدہ ہے کہ ایک نظریہ قایم ہوا کچھ عرصہ کے بعد اسی فلسفی نے یا دوسرے نے اس کی پُرزور الفاظ میں تردید کی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ آسمان کے وجود کو زمین سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی

لیکن آج یہ حال ہے کہ فلسفی مصنفین نے اپنی تصنیفات میں فلکیات کا جزاڑا دیا
نحن رجال و ھم رجال وہ بھی آدمی تھے ہم بھی آدمی ہیں۔ اگر ہم یہ بھی فرض
کرلیں کہ اعادہ معدوم محال ہے تب بھی اسلامی عقیدہ کو اس سے صدمہ نہیں پہنچتا
کیونکہ موت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے اجزائے ترکیبی منتشر ہو جاتے ہیں۔ معدوم
نہیں ہوتے اس لئے ان کا اجتماع ممکن ہے۔ اس کے علاوہ ہر جسم میں اجزائے
اصلیہ ہوتے ہیں جو کسی حالت میں فنا نہیں ہوتے۔ اور قیامت کا دارومدار ان ہی اجزائے
اصلیہ پر ہے۔ آج تک کوئی ایسی دلیل قائم نہیں ہوئی جس سے اجزائے اصلیہ کا باقی
رہنا محال ثابت ہو۔ اس لئے مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اجزائے اصلیہ باقی رہتے ہیں
الہ آباد میں میرے ایک دوست نے جو اپنے کو فلسفی جانتے تھے مجھ سے سوال کیا کہ
قیامت کیونکر ممکن ہے۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ اس زمانہ میں فلسفی کسے کہتے ہیں جو نماز
نہ پڑھے۔ روزہ نہ رکھے۔ شرعی احکام کا پابند نہ ہو۔ وہ حضرت ان ہی صفات سے
متصف تھے۔ حالانکہ فلسفی کو خدا کے وجود کا سب سے زیادہ معتقد ہونا چاہیئے۔ اور
سب سے زیادہ احکام شرعی کا پابند ہونا چاہیئے۔ ان کو اپنے فلسفہ پر بڑا ناز تھا۔ میں
نے جب ان سے قیامت کے نہ ہونے کی دلیل پوچھی تو جواب دیا کہ فرض کیجئے کہ
مرغی کو بلی کھا گئی، اور بلی کو کتا کھا گیا۔ کتے کو بھیڑیا کھا گیا۔ بھیڑیے کو شیر کھا گیا۔ اس
لئے ہر ایک کا گوشت و پوست دوسرے کا گوشت و پوست ہو گیا۔ اب اگر قیامت
قائم ہوئی تو ایک شیر نہیں اٹھے گا بلکہ اس کے ساتھ ہزاروں بے گناہ جانور بھی زندہ

ہوں گے۔ اگر شیر کو سزا دی گئی تو ان تمام جانوروں کو بھی سزا دی گئی جو بیگناہ اس کے اجزائے بدن بنگئے ہیں۔ لہذا قیامت کا ہونا ناممکن ہے۔ یہ ان کی مایۂ ناز دلیل تھی۔ میں نے عرض کیا کہ گاؤں کی جاہل عورت جو نہ اصول فلسفہ سے واقف ہے نہ قوانین سائنس سے دلچسپی رکھتی ہے۔ بھینس کا دودھ نکالتی ہے۔ اس کو بلوتی ہے اور دو جُز نکالتی ہے۔ گھی اور مٹھا۔ نہ گھی کا کوئی جُز مٹھے میں جاتا ہے نہ مٹھے کا کوئی جز گھی میں رہتا ہے۔ حالانکہ فطرتاً یہ دونوں چیزیں بھینس کے بالکھ میں متحد تھیں تو جب گاؤں کی جاہل عورت اتنی طاقت رکھتی ہے کہ فطری اتحاد کے اس طرح ٹکڑے کر دے کہ ایک جز دوسرے سے نہیں ملنے پاتا تو خدا جو قادر مطلق ہے کیا اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ غیر فطری اتحاد کو علیحدہ علیحدہ کر دے۔

اس کے علاوہ آجکل ایسی مشینیں بکثرت ہیں جو دودھ اور پانی کو علیحدہ کر دیتی ہیں۔ جب انسان میں یہ طاقت ہے تو خدا میں اتنی طاقت کا ہونا محال ہے کہ وہ شیر، بھیڑیے، کتے، بلی، مرغی وغیرہ کو علیحدہ کر دے؟ میرے دوست نے اس کے جواب میں گہری خاموشی اختیار کی۔ اس کے بعد کہا کہ میں سوچکر جواب لکھوں گا۔ آج تقریباً دس برس کا عرصہ ہوا کہ اُن کی لب کشائی نہ ہوئی۔

عزیزم ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ کہتا ہوں کہ اعادہ معدوم کو

فلسفی اس لئے محال جانتے ہیں کہ اس کے ساتھ زمانہ کا پلٹنا بھی ضروری ہے
اگر زید دوبارہ زندہ ہو گیا تو معہ اس زمانہ کے عود کرے گا جس میں وہ پہلے تھا اور
زمانہ کا عود کرنا محال ہے۔ اس لئے اعادہ معدوم محال ہے۔ میرے خیال سے
یہ دلیل قابل قبول نہیں کیونکہ شے کی ماہیت میں زمانہ کو دخل نہیں ہے اگر
شے کی ماہیت میں زمانہ کو دخل ہوتا تو ایسا ممکن تھا۔ اسی طرح بطور تعین لازم
ماہیت بھی نہیں ہے۔

(۲) عزیزم آپ نے اس سوال میں بھی حکماء کے مسلمہ کو پیش کیا ہے۔
حالانکہ ان کے مسلمات ان ہی کے لئے دقیع ہیں۔ وہ لوگ آسمان میں خرق والتیام
اس لئے محال جانتے ہیں کہ ان میں حرکت طبعی نہیں ہے یعنی سیدھی حرکت نہیں
کر سکتے۔ اور جس چیز میں حرکت طبعی نہ ہو اس میں خرق والتیام ناممکن ہے اِن کے
قول کی تردید ان ہی کے قول سے کرتا ہوں۔ اُن کا یہ بھی مسلمہ ہے کہ آسمانوں
میں حرکت قسری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس چیز میں حرکت طبعی نہ ہو اس میں حرکت
قسری کا ہونا ناممکن ہے۔ حالانکہ یہ ان کے مسلمات کے خلاف ہے۔ وہ خود
قائل ہیں کہ آٹھ آسمانوں میں دو قسم کی حرکت پائی جاتی ہے۔ ارادی اور قسری
وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ آٹھ آسمان فلک نہم کی وجہ سے حرکت قسری کرتے ہیں۔ جب
آسمان حرکت قسری کر سکتے ہیں تو ان میں حرکت طبعی بھی ضرور ہوگی۔ کیونکہ یہ دونوں
چیزیں توام ہیں۔ اور جس میں حرکت طبعی کی استعداد ہوگی اس میں خرق والتیام

محال نہیں ہو سکتا۔ اس لئے رسول کا شب معراج آسمانوں پر جانا ممکنات سے ہے

(۳) نماز میت حقیقتاً دعا ہے نماز نہیں ہے۔ اس کو مجازاً نماز کہتے ہیں اس کے نماز نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کوئی نماز بغیر الحمد کے نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں الحمد نہیں ہے اس لئے اس کو نماز نہیں کہا جا سکتا۔ اسی وجہ سے اس میں وضو کی شرط نہیں ہے۔ جیسا کہ صاحب شرح لمعہ نے لکھا ہے۔

(۴) عزیزم اس سوال کا جواب آپ نے معالم میں دیکھ لیا ہوتا۔ جو جز اپنے کل سے حقیقت میں متحد ہوتا ہے اس پر اور کل پر ایک لفظ بولا جاتا ہے جیسے پانی سمندر پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور اس کے ایک قطرہ پر بھی۔ کیونکہ پانی کا ایک قطرہ اور سمندر حقیقت میں متحد ہیں۔ اسی طرح قرآن اور اس کا ہر ایک جز حقیقت میں متحد ہیں۔ اس لئے ہر ایک آیت اور مجموع آیات پر قرآن کا اطلاق ہوتا ہے۔

(۵) بیشک ہمارے نزدیک انبیاء علیہم السلام گناہان صغیرہ کبیرہ سے پاک ہیں۔ اس آیت میں ذنب سے مقصد گناہ نہیں ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ ہم نے تمہیں کھلی ہوئی فتح دی تاکہ خدا تمہارے ان عیبوں کو دور کرے جو دنیا دار مکہ والے ظاہری فتح و غلبہ نہ ہونے کی وجہ سے تمہارے اندر خواہ مخواہ پیدا کرتے تھے۔ اب وہ ننگ و عار باقی نہیں رہی۔ کیونکہ تم بحیثیت ایک فاتح کے مکہ میں داخل ہو رہے ہو۔

(۶) اس آیت میں امت والوں کو بتانا مقصود ہے۔ یعنی اے رسول تمہاری

اُمت پہلے سے غافل تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ رسول کسی وقت بھی غافل نہیں رہے اور اگر غافل کا اشارہ رسول ہی کی طرف مانا جائے تب بھی شان رسالت کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ غفلت اور چیز ہے اور جہالت اور شے ہے۔ غفلت کا استعمال اس شخص کے لئے ہوتا ہے جو عالم ہو۔ اس لئے آیت کا مقصد یہ ہے کہ اس سے قبل دُنیا والوں کی نگاہ میں غافل تھے یا حجاب بشریت کی وجہ سے متوجہ نہ تھے۔

(۷) عزیزم یہ آیت فعصی آدم ربّہ فغوی یعنی آدم نے اپنے رب سے سرکشی کی اس لئے گمراہ ہوگئے۔" خود اس امر کا ثبوت ہے کہ آدم سے نہ عصیاں صادر ہوا نہ وہ گمراہ تھے۔ لہذا گمراہی اور سرکشی کا ترجمہ کرنا غلط ہے۔ کیونکہ بظاہر غلطی آدم وحوا دونوں سے سرزد ہوئی۔ اس لئے خدا کو چاہئے کہ دونوں کو سرکش اور گمراہ کہتا۔ بلکہ حوّا آدم کے برانگیختہ کرنے میں واسطہ تھیں اس لئے حوّا ہی زیادہ گنہگار ہوئیں۔ آیت کے رُخ کا آدم کی طرف ہونا اور حوّا سے پہلوتہی کرنا اس کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ فعل عصیاں نہ تھا۔ ورنہ دونوں اس میں مساوی تھے بلکہ ترک اولی حسب منزلت قابل گرفت سمجھا گیا۔ آدم کی منزلت حوّا سے زیادہ تھی۔ اس لئے جرم کا رُخ ان ہی کی طرف ہوا۔ اور ترک اولی قرب منزلت کی وجہ سے گناہ معلوم ہونے لگا۔

قمر الزماں سبزواری

نامۂ گرامی مولوی علی عبّاس صاحب متوطن چھولس ضلع بُلند شہر

جناب عمدۃ العلماء زبدۃ الفضلا اُستاذی المعظم علامہ سید قمر الزماں صاحب قبلہ مدظلہ العالی

گزارش یہ ہے کہ جناب والا کو خاکسار چند سوالوں کے حل کرنے کی زحمت دینا چاہتا ہے۔ اُمید ہے کہ مہربانی فرما کر جواب شافی عنایت فرمائیں گے۔

(۱) رسول اللہ کی مشہور حدیث ہے۔ "من اعان تارک الصلوٰۃ بلقمۃ اوکسوۃ فکانما قتل سبعین نبیا اولھم آدم واٰخرھم محمد مصطفیٰ۔ یعنی جس شخص نے تارک نماز کی ایک لقمہ یا کپڑے سے اعانت کی گویا اُس نے ستر انبیا کو قتل کیا جن کے اول آدم اور آخری محمد مصطفیٰ ہیں"

سوال یہ ہے کہ اگر اس حدیث پر عمل کیا جائے تو خیرات کا باب بند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر انسان بے نمازی ہیں۔

(۲) اہلبیت افضل ہیں یا قرآن۔ اگر اہلبیت افضل ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اہلبیت علیہم السلام بلکہ خود جناب رسالتمآبؐ سے بغیر وضو کئے مصافحہ کر سکتے ہیں لیکن قرآن کو نہیں چھو سکتے۔

(۳) خداوند عالم قرآن شریف میں ارشاد فرماتا ہے "من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا۔ یعنی جس نے میرے حکم سے روگردانی کی اس کی روزی تنگ ہو جائے گی"۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کفار سب سے زیادہ عیش و عشرت میں

ہیں۔ ان کی روزی بالکل تنگ نہیں کی جاتی۔ بلکہ روز بروز انکو ترقی ہو رہی ہے

(۴) دوسرے غسلوں کی طرح غسل جنابت میں وضو کیوں نہیں کیا جاتا۔

(۵) خدا نے حج کیوں واجب کیا۔ اور اگر واجب کیا تھا تو ہر شخص کو مالدار بنانا چاہیے تھا تاکہ کوئی انسان حج سے محروم نہ رہتا۔ فقط۔

آپ کا دُعاگو۔ علی عباس۔ متوطن چھولس ضلع بلند شہر

جواب

حدیث تارک الصلوٰۃ۔ غسل جنابت کے بعد وضو نہ ہونے کا حل اہلبیت سے بے وضو مصافحہ کیوں حرام نہیں ہے۔ وغیرہ

اُستاد نواز دُعا

آپ کے سوالات کے جوابات مرسل ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ فرصت نہیں ملتی ورنہ اس سے زیادہ تفصیل کرتا۔

(۱) رسول اللہ نے جو تارک الصلوٰۃ کی اعانت کو منع فرمایا ہے اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو عام لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ بے نمازی کو اس نیت سے کچھ نہ دے کہ وہ نماز نہ پڑھنے پر اعانت ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص غریب کی اعانت شیعہ یا عام مسلمان یا بندہ خدا ہونے کی حیثیت سے کرے تو وہ یقیناً ثواب کا مستحق ہوگا۔

(۲) پیغمبر اسلام اور اُن کے اہل بیت علیہم السلام قرآن سے افضل ہیں

کیونکہ ناطق صامت سے افضل ہوتا ہے یہ حضرات قرآن ناطق ہیں۔ لیکن اگر ان سے مصافحہ کرنے کا حکم وضو کے ساتھ دیا جاتا تو عسر و حرج لازم آتا۔ کیونکہ ان حضرات کی قدمبوسی کے لئے اکثر اوقات ضرورت پڑتی تھی۔ اس لئے شریعت نے اس بار میں اُمّت کو سبکدوش رکھا۔

(۳) من اعرض ذکری۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ جب امام مہدیؑ ظہور فرمائیں گے تو جو خدا کے ذکر سے اس وقت روگردانی کرے گا اُس کی روزی تنگ ہوگی۔

اس کے علاوہ روحانی روزی کفار کے لئے اب بھی تنگ ہے۔

(۴) غسل جنابت کے بعد وضو نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس غسل میں مادہ منویہ قلیل مقدار میں نکلتا ہے۔ اور اس قلیل مقدار کا مصرف بھی خارجی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی سمیت بھی قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔ لہذا صرف غسل کافی ہو جاتا ہے۔

(۵) حج کے واجب ہونے میں حسب ذیل فوائد ہیں۔ مساوات، اتحاد، دوسری اقوام پر رعب، اشتہار، جناب ابراہیم علیہ السلام کی یادگار کا ابقا۔ کیونکہ جب بنی نوع انسان حج کے موقع پر جمع ہوتے ہیں تو بادشاہ و رعایا میں امتیاز نہیں ہوتا۔ اس لئے مساوات و اتحاد کا ہونا وہاں ضروری ہے۔ اس اجتماع کا اثر اغیار اقوام پر پڑتا ہے۔ حج کے موقع پر کسی شے کے اعلان کرنے سے تمام دُنیا

میں اس کا اشتہار ہو جاتا ہے کیونکہ مختلف مقامات کے لوگ وہاں آتے ہیں اس لئے باقی فوائد بھی ظاہر ہیں۔ اور یہ تو بالکل ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حج ابراہیم علیہ السلام کی یادگار ہے۔ رہا یہ سوال کہ خداوند عالم نے ہر ایک شخص کو مالدار کیوں نہیں بنایا۔ تو یہ کوئی لازم نہیں ہے کہ اگر حج واجب ہو تو ہر شخص مالدار بھی ضرور ہو۔ ورنہ یہی اعتراض زکوٰۃ و خمس و دیگر خیرات کے متعلق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر ہر شخص رئیس ہوتا تو وہ زکوٰۃ و خمس ضرور نکالتا۔ بات یہ ہے کہ ایسا ہونے سے عالم کا نظام فاسد ہو جاتا۔ کیونکہ تمدن جس کی بنیاد ضرورت پر موقوف ہے باقی نہ رہتا یہ سوال اس وقت پیدا ہو سکتا تھا جبکہ خداوند عالم رئیس و غریب دونوں کو حج کا حکم دیتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہر شخص کو بقدر برداشت تکالیف دی گئی ہے۔ رہا محرومی کا افسوس تو اکثر رؤسا باوجود استطاعت حج نہیں کرتے۔ اور اگر کسی غریب کی نیت یہ ہو کہ وہ حج کو جائے تو نیت پر ثواب ہوگا۔

قمر الزماں سبزواری

نامۂ گرامی جناب مولوی بادشاہ حسین صاحب (متوطن) پاراچنار سرحد

بحضور فیض گنجور جناب قبلہ و کعبہ استاذ المعظم دام ظلہ العالی

سلام علیکم۔ بعد از آداب شاگردانہ کے معروض آنکہ مندرجہ ذیل سوالات

کے جوابات سے مستفید فرما کر متشکر فرمایئے گا۔

(۱) اگر کوئی شخص صحیح النسب ہے اور بعد بلوغ نیک کام کرتا ہے اور افعال شنیعہ سے اجتناب رکھتا ہے تو وہ نبی کیوں نہیں ہو سکتا۔ ایک ایسے شخص کو نبی نہ بنانا۔ اور دوسرے شخص کو نبی بنانا عدل الٰہی کے خلاف ہے یا نہیں۔

(۲) خدا نے آدم کے سجدہ کرنے کا حکم ملائکہ کو دیا تھا۔ اگر شیطان نے سجدہ نہیں کیا تو اس پر کوئی الزام نہیں ہے کیونکہ وہ فرشتہ نہ تھا۔

(۳) جب خدا کے یہ علم میں تھا کہ ابلیس میرے حکم کی نافرمانی کرے گا تو پھر اس کو اس قدر بلند درجہ پر کیوں پہنچایا گیا۔

(۴) ابلیس نے جو دلیل اپنی فضیلت کی بیان کی ہے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ کیونکہ یہ مٹی سے بنا ہے۔ اور میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اس کی تردید کیا ہے۔

(۵) میت کے چھونے سے غسل کیوں واجب ہو جاتا ہے۔

(۶) قرآن کی صفت ہے ھدی للمتقین۔ یعنی قرآن متقین کے لئے ہدایت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا متقی ہدایت یافتہ نہیں ہوتے۔ اور کیا قرآن دوسرے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

خاکسار

سید بادشاہ حسین

جواب

ہر نیک نبی نہیں ہو سکتا۔ شیطان کی افضلیت کا معیار۔ شیطان سجدہ پر مامور نہ تھا وغیرہ کا حل

استاد نواز

علیکم السلام۔ مزاج مبارک۔ آپ کے سوالوں کا جواب پیش کرتا ہوں امید ہے کہ آپ قبول فرمائیں گے۔

(۱) نبی اور نیک میں منطق کے قانون کے مطابق عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ہر نبی نیک ہوتا ہے اور ہر نیک کے لئے نبی کا ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ معیار نبوت اس سے بلند ہے۔ اگر افعال حسنہ کا صادر ہونا ہی معیار نبوت ہے تو جناب عیسیٰ ع کو گہوارہ میں نبوت عطا نہ ہونی چاہیے تھی۔ کیونکہ وہاں یہ نہیں کہہ سکتے کہ عیسیٰ ع نے افعال حسنہ کئے تھے اس لئے نبی ہوئے۔ بلکہ معیار نبوت استعداد روح و مادہ ہے۔ اور اس کا علم صرف اسی ذات کو ہو سکتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا۔

(۲) خداوند عالم نے ملائکہ کو مع شیطان کے سجدہ کا حکم دیا تھا۔ ملائکہ کا لفظ غلبہ اور کثرت کی وجہ سے استعمال کیا گیا ہے۔ اگر شیطان سجدہ پر مامور نہ تھا تو اس کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی خلقتنی من نار و خلقتہ من طین۔ ترجمہ۔ مجھے آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے (اس لئے میں افضل ہوں) اس کو تو یہ کہنا چاہیے

تھا کہ اے میرے رب میں ملائکہ میں داخل کب تھا جو مردود ہوا۔ اس کا جواب بتاتا ہے کہ اس کو خود یہ تسلیم تھا۔

(۳) خداوند عالم اپنے علم پر سزا نہیں دیتا جب تک کہ بندہ سے فعل سرزد نہ ہو۔ دُنیا میں بھی ایسا نہیں ہوتا۔ اگر کسی شخص کے متعلق جج کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ آیندہ فلاں شخص کو قتل کرے گا تو اپنے علم کی وجہ سے نہ اس شخص کی ترقی روک سکتا ہے نہ اس کو پھانسی کا حکم دیسکتا ہے۔ اسی طرح خدا فعل سرزد ہونے کے بعد سزا دیتا ہے۔ اس لئے اس سے قبل شیطان جب تک اچھے فعل کرتا رہا مرتبوں میں ترقی ہوتی رہی۔ دوسری مثال پر یوں غور کیجئے کہ اگر کوئی اُستاد اپنے شاگرد کے متعلق جانتا ہے کہ وہ آیندہ سال سرکشی کرے گا لیکن امسال اس کے پرچہ امتحان میں اچھے گئے ہیں۔ کیا اُستاد اس کو فیل کردیگا یا ترقی سے روک دیگا۔ اور اگر ترقی سے روک دیا تو کیا اس کا یہ فعل عدل کے مطابق ہوگا؟ جواب نفی میں ملے گا۔

(۴) شیطان نے جو دلیل اپنی فضیلت کی بیان کی ہے وہ اس کے غلط قیاس پر موقوف تھی۔ کیونکہ آدم عناصر اربعہ سے بنے تھے۔ جو جز شیطان میں تھا وہ بھی آدم میں تھا۔ اور اس کے علاوہ تین عنصر زیادہ تھے۔ اس لئے آدم افضل ہوئے۔ یا اگر شیطان کو بھی عناصر اربعہ سے مرکب مانا جائے اور جزناری کی زیادتی ہو تب بھی آدم سے افضل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آدم میں عناصر اربعہ کے علاوہ نورانیت بھی تھی جس سے شیطان یقیناً محروم تھا۔

(۵) مرنے کے بعد مردہ کے جسم میں سمیت پیدا ہو جاتی ہے اور غیر فطری غذائیں اس کی معین ہوتی ہیں۔ اس لئے مس کرنے سے جو مرض کا شبہ پیدا ہو سکتا ہے اس کے ازالہ کے لئے غسل واجب ہے۔

(۶) بے شک قرآن کی صفت یہ ہے کہ وہ متقین کے لئے ہدایت ہے لیکن، آپ نے منطق کی کتابوں میں یہ پڑھا ہوگا کہ ہدایت کے دو معنی ہیں (۱) راستہ دکھانا (۲) مطلوب تک پہنچا دینا۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی قرآن متقی لوگوں کو مطلوب حقیقی تک پہنچاتا ہے۔ لیکن راستہ تمام بنی نوع انسان کو دکھاتا ہے یہیں سے یہ سوال بھی برطرف ہوتا ہے کہ متقین ہدایت یافتہ ہوتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ وہ معرفت ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن مقصود تک اسی وقت پہنچیں گے۔ جب کہ انہیں کوئی پہنچائے۔

خادم خاکسار قمر الزماں سبزواری (متوطن چھوکس بلند شہر)

تمت بالخیر